ماہنامہ
جولائی 2022ء
طلوعِ اسلام
اشاعت کا اناسی واں سال
لاہور
قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِيَّ بَعْدِي (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائد اعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ ۚ وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٥﴾

یہ نظام‘ جس کے حسین وخوشگوار نتائج کا ذکر اوپر کیا گیا ہے‘ اس کا مرکز کعبہ ہے۔ یہ وہ واجب الاحترام مقام ہے جو تمام انسانوں کے لئے‘ اطاعتِ خداوندی کا سرچشمہ قرار پائے گا۔ اسے ہم نے تمام نوعِ انسان کے لئے‘ خواہ وہ یہاں کے رہنے والے ہوں‘ یا باہر سے آنے والے‘ یکساں طور پر کھلا رکھا ہے۔ (اس کے دروازے‘ دنیا کے ہر ستائے ہوئے انسان کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں‘ اور سب اس کی منفعت بخشیوں میں شریک ہیں)۔ لیکن جو اس میں‘ ظلم وزیادتی کے ساتھ‘ حق کی راہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہوگا، اُسے الم انگیز سزا دی جائے گی۔

یہ لوگ اس نظامِ عدل واحسان سے خود بھی سرکشی برتتے ہیں‘ اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ (ان کی اس دھاندلی کو کب تک برداشت کیا جاسکتا ہے؟ وقت آگیا ہے کہ ان کی روک تھام کے جائے تاکہ انسانیت‘ ان کے جور وستم سے امن میں رہے 21:39)۔ (مفہوم القرآن‘ سورۃ الحج: 25)

طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آ گاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آ نکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتماب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرت مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کران سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

جولائی 2022ء

جلد 75 | شمارہ نمبر 7

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50روپے فی پرچہ
پاکستان: 600روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: اور یہ پارٹی ہو رہی ہے	ادارہ	4
حج کی اہمیت	پرویز علیہ الرحمۃ	5
درسِ قرآن (سورۃ النساء آیات 144 تا 155)	پرویز علیہ الرحمۃ	9
قرآنی نظریہ قومیت	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	33
مغربی جمہوریت موجودہ پاکستان اور قرآن	خواجہ ازہر عباس، کراچی	43
گناہ اور جرم میں فرق	جمیل احمد عدیل	51
غیر مسلموں کے نیک کاموں کے ثواب کا مسئلہ	ادارہ	54

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool) Episode No.8	59

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

اور یہ پارٹی ہو رہی ہے

مملکتِ خداداد اِسلامی جمہوریہ پاکستان میں چھوٹے اور بڑے ہزاروں ہوٹل اور ریستوران ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجے کے ہوٹل اور ریستوران بھی سینکڑوں کی تعداد سے کم نہ ہوں گے۔ آپ کسی شام' کسی ہوٹل میں چلے جایئے۔ رمضان کے مہینہ میں کسی نہ کسی کو افطار پارٹی دی جا رہی ہوگی۔ عام دنوں میں ظہرانہ' عصرانہ' عشائیہ' ہائی ٹی اور پتہ نہیں اس کے علاوہ اور کیا کیا۔

یہ پارٹیاں بالعموم Stablished لیڈروں یا بننے والے لیڈروں کے اعزاز میں متوقع مفاد کے حصول کے لئے تقریب کا کام دیتی ہیں۔ بعض لیڈر ایسے بھی ہیں جن کے اعزاز میں ہفتوں تک پارٹیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایک ایک پارٹی میں پانچ پانچ سو مہمان۔ ہوٹل والے' پانچ سو روپے سے لے کر پندرہ سو روپے فی کس کے حساب سے وصول کرتے ہیں۔ اس کے بدل میں جو کچھ وہاں سے ملتا ہے اس میں پچاس فیصدی چمک دمک۔ چالیس فی صدی بیماری اور دس فیصدی غذا ہوتی ہے۔ یہ اس قوم کے مشغلے ہیں جس کے کروڑوں نفوس ایسے ہیں جنہیں دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ ایک دن میں ہی آٹا چینی کے حصول میں قطار میں کھڑی 18 خواتین دم گھٹنے سے مر جاتی ہیں۔ جس کی آبادی کا بیشتر حصہ منجمد کر دینے والے جاڑوں اور جھلسا دینے والی گرمیوں میں سڑکوں پر سوتا ہے۔ جن کے لاکھوں گھرانے خستہ وخراب در بدر مارے مارے پھر رہے ہیں جن کی ہزارہا بیٹیاں اور بہنیں ہاتھ پیلے ہونے کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی ہیں۔ جن کے یتیموں کا کوئی وارث نہیں' جن کی بیواؤں کا کوئی پرسان حال نہیں' جن کے بیماروں کو دوا میسر نہیں' جن کے مُردوں کو کفن تک نصیب نہیں' یہ جگمگ جگمگ کرنے والی پارٹیاں اسی قوم کے غم میں گھلنے والے لیڈروں کو دی جاتی ہیں۔ نہ پارٹیاں دینے والوں کو شرم آتی ہے۔ نہ انہیں قبول کرنے والوں کو حیا۔ یہ انسانی نظام کی وہ ناہمواریاں ہیں جنہیں قرآن فساد فی الارض کہہ کر پکارتا ہے اور جس کا فطری اور لازمی نتیجہ بربادی اور تباہی قرار دیتا ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

قسم ہے بغداد اور رومتہ الکبریٰ کے کھنڈرات کی! یہ کچھ قوموں اور سلطنتوں کے مٹنے کے زمانے میں ہوا کرتا ہے' ابھرنے کے وقت نہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حج کی اہمیت

ذیل میں ہم پرویز علیہ الرحمۃ کی وہ تقریر شائع کر رہے ہیں جو 1951ء میں حج کے موقع پر ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہوئی۔

انسان کی ابتدائی زندگی پر غور کیجئے۔ زمین پر بڑے بڑے پُرآشوب دریا اور ان کی حدود فراموش طغیانیاں' مہیب جنگل اور ان میں بسنے والے خوفناک درندے' آسمان پر کڑکتی ہوئی بجلیاں اور گرجتے ہوئے بادل۔ اس ہیبت انگیز ماحول اور لرزہ انگیز حالات میں گھرا ہوا انسان' نہتا اور تنہا! انہی خطرات کے ہجوم نے اس کے جذبۂ معاشرت (Head Institute) کو بیدار کیا اور اس نے الگ الگ رہنے کے بجائے خاندانوں میں مل جل کر رہنے کا طریقہ اختیار کیا۔ انسانی معاشرتی زندگی کی یہ پہلی شکل تھی۔ اس سے ذرا آگے بڑھے تو خاندانوں نے قبائل کی صورت اختیار کر لی۔ اس اجتماعی زندگی سے اس نے فطرت کی قوتوں کو رفتہ رفتہ مسخر کرنا شروع کر دیا لیکن خود انسانوں کے مشترکہ مفاد کے ٹکراؤ سے خاندانوں اور قبیلوں میں باہمی مخالفتیں شروع ہو گئیں اور اس طرح خارجی خطرات کی جگہ داخلی عداوت نے لے لی۔ یہی قبائل پھیل کر قومیں بن گئے۔ اس وقت تک دنیا قوموں میں بٹی چلی آ رہی ہے اور مختلف قوموں کی باہمی عداوت اور رقابت کا جو عالم ہے وہ کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اس اعتبار سے اس دورِ تہذیب وتمدن کا انسان بھی ٹھیک اسی مقام پر ہے جہاں ابتدائی دورِ وحشت و بربریت کا انسان تھا۔ بس اتنے فرق کے ساتھ کہ اس وقت اسے صرف ایک دوسرے پر پتھر پھینکنا آتا تھا اور آج یہ ترقی کرتے کرتے ایٹم بم پھینکنا بھی سیکھ گیا ہے۔ قومیت پرستی کی اس لعنت سے صرف یہی نہیں ہوا کہ دنیا میں کہیں امن وسکون باقی نہیں رہا۔ اس نے انسانیت کے بنیادی تصورات تک بدل دیئے ہیں ڈاکٹر ہکسلے کے الفاظ میں:

> دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام مغرب نے پھر اپنے ناکام تجربہ کو دہرایا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ لیگ آف نیشنز کا نام U.N.O رکھ دینے سے ناکامی کامیابی میں بدل جائے گی۔ U.N.O کامیاب ہوتی ہے یا ناکام' اسکا فیصلہ وقت کر دے گا۔ یہ ہے انسانی معاشرہ کی وہ شکل جسے انسانی عقل آج تک تجویز کر سکی ہے۔ لیکن انسانی عقل سے ماوراء ایک اور ذریعۂ علم بھی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ وحی نے اس مسئلہ کا حل کیا بتایا ہے

قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور خدائے واحد کے انکار پر مبنی ہے

اور انسان کی بہ حیثیت انسان کی کچھ قیمت نہیں سمجھتی، دوسری طرف یہ باہمی تفرقہ انگیزی کا موجب ہے، انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس ٹھہراتی ہے۔

اہل مغرب پر یہ حقیقت پہلی جنگ کے بعد ہی بے نقاب ہوگئی تھی کہ ان کی تباہیوں اور بربادیوں کی بنیادی وجہ ان کی قومیت پرستی ہے۔لیکن چونکہ انسانی عقل ابھی تک قومیتوں کے دائرے سے آگے بڑھ نہیں سکی اس لئے انہوں نے اس کا علاج جمعیت الاقوام یعنی لیگ آف نیشنز کی تشکیل میں سوچا، لیکن علامہ اقبال کے الفاظ میں کفن چوروں کی جماعت جس بری طرح ناکام رہی واقعات اس پر شاہد ہیں، اس کے متعلق (Reves) اپنی کتاب Anatomy of Peace میں لکھتا ہے کہ:

لیگ آف نیشنز کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم کی گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے نمائندوں کو یکجا کر کے باہمی بحث وتمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جاسکتا ہے۔

> بُعدِ مکانی جو دنیا کی الگ الگ حکومتوں کے لئے وجہِ جواز تھا اب ختم ہو چکا ہے اب ان حکومتوں کی حدود ایک دوسرے پر بچھ چکی ہیں۔تمام نوع انسانی اب ایک ملت بن چکی ہے۔ 1900ء میں یہ ناممکن تھا کہ تمام دنیا کے معاملات کو ایک نظام امن کی شکل میں منضبط کیا جاسکتا

دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام مغرب نے پھر اپنے ناکام تجربہ کو دہرایا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ لیگ آف نیشنز کا نام U.N.O رکھ دینے سے ناکامی کامیابی میں بدل جائے گی۔U.N.O کامیاب ہوتی ہے یا ناکام، اس کا فیصلہ وقت کر دے گا۔ یہ ہے انسانی معاشرہ کی وہ شکل جسے انسانی عقل آج تک تجویز کر سکی ہے۔لیکن انسانی عقل سے ماوراء ایک اور ذریعۂ علم بھی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔اب دیکھئے کہ وحی نے اس مسئلہ کا حل کیا بتایا ہے۔

آج سے قریب پندرہ سو سال پہلے کی دنیا کا تصور سامنے لائیے جب سامانِ رسل ورسائل اور ذرائع مواصلات اس قدر محدود تھے کہ ایک بستی کے رہنے والے دوسری بستی کے باشندوں سے بھی بمشکل واقف ہو سکتے تھے۔اور یہ چیز کسی کے حیطہ تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ مختلف قوموں کے افراد میں کوئی شے قدر مشترک بھی ہو سکتی ہے۔عین اس زمانہ میں وحی کی زبان نے یہ اعلان کیا کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) یاد رکھو تمام نوع انسان ایک برادری ہے اس لئے نسل اور وطن کی بنیادوں پر انسانوں کی تقسیم تمہاری خود ساختہ اور حقیقت کے خلاف ہے۔خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (4:1) اللہ نے تمام انسانوں کو نفس واحدہ سے پیدا کیا ہے۔اس کے بعد اس نے کہا کہ جب تمام انسان ایک ہی برادری کے افراد ہیں تو ان کے معاشرے کی بنیادیں بھی ایک ہی آئین پر استوار ہونی چاہئیں۔ یعنی دور حاضرہ کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ One Mankind and one world Govt. اس کے بعد ان سے کہا کہ اس حقیقت کے پیش نظر تمام دنیا کے انسانوں کے دو حصے ہو جائیں گے ایک وہ جو اس آئیڈیالوجی کو اپنا ضابطہ حیات بنالیں انہیں ماننے والوں کی جماعت یا امت مسلمہ کہا جائے گا۔دوسرے وہ جو اس روش زندگی سے انکار کریں اور انسانوں کی قومی گروہ بندیوں کو قائم رکھتے ہوئے انہیں ایک دوسرے سے ٹکراتے رہیں۔انہیں غیر مسلم کہا جائے گا۔امت مسلمہ کے سالانہ اجتماع کا نام حج ہے۔اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمام

دنیا کے انسان جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ تمام دنیا میں اس آئین کے مطابق حکومت ہونی چاہئے جو وحی نے مرتب کیا ہے' اپنے اپنے ملکوں سے نمائندے چنیں' یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی قیادت میں مرکز وحدت انسانیت یعنی کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان کا باہمی تعارف ہو پھر یہ سب نمائندگان ملت اپنے میں سے ایک صدر کا انتخاب کریں اور تمام دنیا کے حالات کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایسا پروگرام مرتب کریں جسے آئندہ سال کے لئے بطور مشترکہ اصول اختیار کیا جائے۔ ان کا منتخب کردہ صدر اپنے خطبۂ حج میں اس پروگرام کا اعلان کردے جو دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان اس پروگرام کی جزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ مختلف ممالک پر ان کا کیا اثر پڑے گا۔ ان مذاکرات کے بعد یہ نمائندے اپنے اپنے ملکوں کو واپس آجائیں اور اس طے شدہ پروگرام کی روشنی میں اپنے اپنے ہاں کا نظم و نسق چلائیں۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن کریم نے تمام دنیا کے انسانوں کو ایک امت بنانے اور ان کے معاشرتی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بنایا ہے۔ قرآن نے حج کے اس مقصد کو نہایت مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے آپ ان مختصر الفاظ پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غایت اس سے بلند' اور کوئی انداز بیان اس سے بلیغ ہوسکتا ہے؟ ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کا اجتماع ایسا ہے جس کے فائدے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28) اور اس کی غرض و غائت کیا ہے؟ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97)۔ یعنی اس اجتماع سے مقصود یہ ہے کہ انسانیت اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہو جائے۔ غور کیجئے! کیا دنیا میں کسی کانفرنس' کسی اسمبلی' کسی پارلیمان' کسی اجتماع کا مقصد اس سے بلند بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اجتماع دنیا میں شرف انسانیت کے قیام اور انسانی معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کا ذریعہ ہو۔ کسی خاص قوم' خاص ملک' خاص ملت کے قیام کا باعث نہیں بلکہ تمام نوع انسان کے قیام کا موجب۔ یہ ہے حج کے اجتماع کا مقصد یعنی قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97)۔ آج دنیا چاروں طرف سے تھک تھکا کر اس نقطہ تک تو آ پہنچی ہے کہ دنیا سے قومیتوں کی تفریق کو مٹا کر اس کی جگہ ایک عالمگیر برادری کا قیام نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر Gauld اپنی کتاب Man, Nature and Time میں لکھتا ہے کہ:

اب یہ چیز بالکل فطری نظر آتی ہے کہ تمام نوع انسانی کی ایک منظم برادری قائم کر دی جائے۔

اور ساری دنیا میں ایک حکومت کا خیال بھی روز بروز پھیلتا جا رہا ہے۔ چنانچہ H.G.Wells نے 1942ء میں سائنس کانفرنس میں کہا تھا کہ:

> بُعدِ مکانی جو دنیا کی الگ الگ حکومتوں کے لئے وجہ جواز تھا اب ختم ہو چکا ہے اب ان حکومتوں کی حدود ایک دوسرے پر بجھ چکی ہیں۔ تمام نوع انسانی اب ایک ملت بن چکی ہے۔ 1900ء میں یہ ناممکن تھا کہ تمام دنیا کے معاملات کو ایک نظام امن کی شکل میں منضبط کیا جاسکتا۔ اُس وقت ایک حکومت صرف ایک خاص رقبے میں ہی نظم و نسق قائم رکھ سکتی تھی' عالمگیر نظام قائم نہیں کر سکتی تھی۔ اب بُعدِ مکانی کے ناپید ہو جانے سے ایک عالمگیر نظام نہ صرف ممکن العمل ہو چکا ہے بلکہ موجودہ جنگ اور اس کے بعد کے لوازمات کے پیش نظر اسکی ضرورت بھی اشد ہو چکی ہے۔

یعنی تمام دنیا میں ایک حکومت قائم کرنے کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہو رہا ہے لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس خیال

کوعمل میں کس طرح لایا جائے! اس کا حل بھی وہی ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ یعنی ساری دنیا کے لئے اصولی طور پر آئین بھی ایک ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا آئین وہی ہوسکتا ہے جو مختلف اقوام کی مصلحت کوشیوں اور مفاد پرستیوں کے بجائے تمام نوعِ انسانی کی مشترکہ نشوونما کے اصول پر قائم ہو۔ اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں نظامِ ربوبیت ہے، جس دن دنیا کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اسی دن ایک عالمگیر حکومت کا خیال عملی شکل اختیار کر لے گا۔ حج کا اجتماع اسی نظام کی طرف دعوت کا پیغام ہے۔

یہ ہے حج کا قرآنی مفہوم: آج عالم اسلام چاروں طرف سے مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ غیر مسلم قومیں ان کے خلاف متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں۔ مختلف ممالک کے مسلمان مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں کہ انسانی لغتوں کا متحدہ طور پر مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور روابط کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن کسی کی نگاہ اس طرف نہیں اٹھتی کہ جو طریق ربط و نظم ہمارے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا اسے ہم ایک بے کیف رسم بنائے ہوئے ہیں اور اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ اگر کہیں ہمارے اس اجتماع میں صحیح زندگی کی حرارت پیدا ہو جاتی تو اِس وقت عرفات کے میدان میں جو اجتماع ہو رہا ہے ساری دنیا کی نگاہیں اس کے فیصلوں پر لگی ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کا مقام ہی یہی تجویز کیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143) ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی مرکزی امت بنایا ہے اور تمہارا فریضۂ حیات یہ ہے کہ تم تمام اقوام عالم کے اعمال کی نگرانی کرو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ: تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110) تمام نوعِ انسانی کو حق و انصاف کے راستہ پر چلاؤ، اور انہیں ظلم و سرکشی کی راہوں سے روکو۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم کو اس قسم کی پوزیشن اسی صورت میں حاصل ہوسکتی ہے جب اس کے پاس اتنی قوت ہو کہ وہ اپنے فیصلوں کو تمام اقوام عالم سے منوا سکے، اس قسم کی قوت مرکزیت کے بغیر ناممکن ہے۔ آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سے بھی زیادہ ہے جغرافیائی حیثیت سے دیکھئے تو انہیں ایک ایسی مرکزی پوزیشن حاصل ہے جو دنیا کی کسی اور قوم کو میسر نہیں۔ انڈونیشیاء سے لے کر مراکش تک ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جو مسلسل یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ اسباب اتحاد و یگانگت کو دیکھئے تو ان سب کا سرچشمۂ فکر اور محرک عمل ایک ہے۔ لیکن حالات کی ایسی قابل رشک سازگاری کے باوجود ہماری حالت یہ ہے کہ اقوام عالم کی امامت و قیادت تو ایک طرف، ان کی ہمسری اور برابری بھی نصیب نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہماری مرکزیت گم ہو چکی ہے اگر یہ مرکزیت زندہ ہو جائے تو ہماری بے پناہ قوتوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ یہ مرکزیت کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کی دوبارہ زندگی اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہمارا حج کا اجتماع قرآنی خطوط پر متشکل ہو جائے۔

اگر کہیں ہمارے اس اجتماع میں صحیح زندگی کی حرارت پیدا ہو جاتی تو اِس وقت عرفات کے میدان میں جو اجتماع ہو رہا ہے ساری دنیا کی نگاہیں اس کے فیصلوں پر لگی ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کا مقام ہی یہی تجویز کیا تھا

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

درسِ قرآن

سورۃ النساء آیات 144 سے 155

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡكٰفِرِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ اَتُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ عَلَيۡكُمۡ
سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لَهُمۡ نَصِيۡرًا ۙ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا
وَاَصۡلَحُوۡا وَاعۡتَصَمُوۡا بِاللّٰهِ وَاَخۡلَصُوۡا دِيۡنَهُمۡ لِلّٰهِ فَاُولٰۤٮِٕكَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ وَسَوۡفَ يُؤۡتِ اللّٰهُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ
اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفۡعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمۡ اِنۡ شَكَرۡتُمۡ وَاٰمَنۡتُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيۡمًا ﴿۱۴۷﴾ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الۡجَهۡرَ
بِالسُّوۡٓءِ مِنَ الۡقَوۡلِ اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيۡعًا عَلِيۡمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنۡ تُبۡدُوۡا خَيۡرًا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ اَوۡ تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ
فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيۡرًا ﴿۱۴۹﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يُّفَرِّقُوۡا بَيۡنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ
وَيَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّنَكۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّتَّخِذُوۡا بَيۡنَ ذٰ لِكَ سَبِيۡلًا ۙ﴿۱۵۰﴾ اُولٰۤٮِٕكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ
حَقًّا ۚ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمۡ يُفَرِّقُوۡا بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ اُولٰۤٮِٕكَ
سَوۡفَ يُؤۡتِيۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۵۲﴾ يَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ
السَّمَآءِ فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰٓى اَكۡبَرَ مِنۡ ذٰ لِكَ فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلۡمِهِمۡ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا
الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَعَفَوۡنَا عَنۡ ذٰ لِكَ ۚ وَاٰتَيۡنَا مُوۡسٰى سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ
الطُّوۡرَ بِمِيۡثَاقِهِمۡ وَقُلۡنَا لَهُمُ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُلۡنَا لَهُمۡ لَا تَعۡدُوۡا فِى السَّبۡتِ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ
مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ وَكُفۡرِهِمۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ وَّقَوۡلِهِمۡ
قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۱۵۵﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1971ء کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النساء کی آیت 144 سے ہو رہا ہے: (4:144)۔

کافر اور منافق کے علاوہ مذہب اور دین میں فرق کی نوعیت:

پچھلے اتوار کو الیکشن کی پابندیوں کی وجہ سے درس کا ناغہ رہا تھا۔ اس لیے تجدید یادداشت کے لیے عرض کردوں کہ بات منافقین کی چلی آ رہی تھی۔ قرآنِ کریم نے منافقین اور کفار کو یوں تو ایک ہی کیٹگری (شق) میں رکھا ہے لیکن جیسا کہ ذرا

آگے چل کر ہمارے سامنے بات آئے گی' وہ منافقین کو کافروں سے بھی زیادہ بدتر مخلوق قرار دیتا ہے۔ خدا کی طرف سے جو دین ہے' وہ انفرادی چیز نہیں ہے۔ مذہب انفرادی ہوتا ہے' یہ خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق ہوتا ہے' یہ پوجا پاٹ' گیان دھیان اور پرستش ہے' بس اتنا ہی تعلق ہوتا ہے اور اسے ہر فرد الگ الگ' اپنی اپنی جگہ' انفرادی طور پر کر سکتا ہے بلکہ اس میں جتنی زیادہ انفرادیت ہو' تنہائی ہو' خلوت ہو' علیحدگی ہو' وہ اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے سادھو ہوں' سنیاسی ہوں' بن باسی ہوں' عیسائیوں کے Saints (صوفی) ہوں' مسلمانوں کے صوفی اور اولیاء اللہ ہوں' یہ آبادیوں سے بھی دور بھاگتے ہیں' جنگلوں میں چلے جاتے ہیں' اگر آبادی میں رہتے ہیں تو خلوتوں میں رہتے ہیں' حجروں میں رہتے ہیں' خانقاہوں میں رہتے ہیں' زاویوں میں رہتے ہیں۔ گویا جتنا زیادہ کوئی تنہا ہوتا چلا جائے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا اتنا ہی خدا سے تعلق بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مذہب میں یہی شکل ہوتی ہے۔

یہ انسان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہوتا ہے۔ جیسا ذہن نے تصور کر لیا اس کے مطابق راستے اختیار کر لیے لیکن دین اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ وہاں تو كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (9:119) ہونا پڑتا ہے یعنی سفرِ زندگی صادقین افرادِ کارواں کی معیت میں طے کرنا پڑتا ہے اور جنت میں جانے کے لیے ضروری ہے کہ: فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ (89:29) میرے بندوں میں داخل ہو پھر جنت میں جا سکتا ہے۔ یہ ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اب اس اجتماعیت کی پہلی بنیادی شرط یہ ہے کہ جو لوگ اس نظریئے پر ایمان رکھیں' اس تصورِ حیات پر یقین رکھیں تو یہ جنہیں جماعت مومنین کہا جاتا ہے' وہ دوسروں سے الگ ایک جماعت بنے گی۔

مذہب کی بنیاد سیکولرازم پر استوار ہوتی ہے اور دین کی دوقومی نظریئے پر

مذہب میں یہ تمام امور مشترک ہوتے ہیں۔ کافر ہوں' مومن ہوں' ہندو ہوں' مسلمان ہوں' سکھ ہوں' عیسائی ہوں' یہ جسے سیکولر نظام کہتے ہیں اس میں ان تمام دنیاوی امور کے فیصلے وہ مشترکہ طور پر کر سکتے ہیں اور اپنی پوجا پاٹ' ایشور کی بھگتی' پرستش' عبادت کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اس کو سیکولر نظام کہا جاتا ہے۔ اس میں دنیاوی امور کے فیصلے مومن اور کافر کا امتیاز کیے بغیر' اکٹھے ہو کر' باہمی مشورے سے ہی سہی' یوں طے کر لیے جاتے ہیں اور Personal (شخصی) معاملات میں ہر ایک کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے دین اور دھرم یعنی مذہب کے مطابق ان کے فیصلے کر لے لیکن جب دین آئے گا تو اس میں تو یہ ایک منفرد جماعت بنے گی' جو صرف انہی لوگوں پر مشتمل ہو گی جو اس نظریہ حیات پر یقین اور ایمان رکھیں جو قرآن کریم نے دیا ہے۔ اسی چیز کو آج کی اصطلاح میں دوقومی نظریہ کہتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے یہ واضح طور پر کہا ہے کہ ہم نے انسانوں کو پیدا کیا' ان میں سے ایک جماعت مومنین کی ہوتی ہے' دوسری کفار کی ہوتی ہے۔ اپنے ذہن میں جب ہم کفار کہتے ہیں تو غیر مسلم بھی اس لفظ کو ایسے سمجھتے ہیں جیسے گالی دیدی ہو۔ یہ کوئی گالی کی بات نہیں' یہ تو وہ ہے جسے کسی سوسائٹی کا Member & Non-Member کہتے ہیں۔ یہ بالکل وہی چیز

ہے۔اس سوسائٹی میں کچھ اس کے ممبرز ہوتے ہیں اور دوسرے نان ممبرز ہوتے ہیں۔اب ظاہر ہے کہ کوئی بھی سوسائٹی‘ کوئی انجمن‘ کوئی اجتماعیت بھی ایسی نہیں ہوتی کہ اس میں ممبرز اور نان ممبرز دونوں اکٹھے ہوجائیں اور آپ اس کو سوسائٹی کہہ دیں۔ رسول اللہ ﷺ کے حقیقی چچا اور جتنے رشتہ دار‘ عزیز تھے وہ دوسری قوم کے افراد تھے‘ قومیت کی تشکیل کی بنیاد دین نے یہ دی کہ نظریۂ زندگی میں اشتراک ہو‘ ایمان پر اشتراک ہو۔جیسا میں نے کہا اس چیز کو دوقومی نظریہ کہتے ہیں۔

دوقومی نظریہ کے بنیادی لوازمات جن کو پیش نظر رکھے بغیر اسلامی مملکت کا خواب پورا نہیں ہوسکتا

پاکستان کا تصور خالص اسلام اور دین کی بنیادوں پہ علامہ اقبالؒ نے دیا تھا۔اس مطالبے کی پہلی بنیاد یہ تھی کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر‘ ایک الگ قوم ہے۔کوئی غیر مسلم اس قوم میں شریک نہیں ہوسکتا۔یہ کسی دوسری قوم کے ممبر نہیں ہوسکتے۔اور دوسری چیز یہ کہ یہ جو الگ قوم بنتی ہے‘ اگر انہوں نے مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنی ہے‘ تو ان کے لیے اپنی آزاد مملکت کا ہونا ضروری ہے۔اسلام ایک زندہ حقیقت بن نہیں سکتا تاوقتیکہ اس امت کو‘ اس ملت کو‘ یہ کامل اختیار و اقتدار نہ ہو کہ وہ خدا کے احکام کو نافذ کرسکیں۔یہ تھی بنیاد پاکستان کے حصول کی۔یہ جو چیز ہے کہ یہ ایک الگ منفرد قوم ہے تو اس کی مملکت میں غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے گا‘ انصاف کیا جائے گا‘ عدل کیا جائے گا‘ انہیں انسانوں کے حقوق دیئے جائیں گے لیکن جو چیزیں اس قوم کے ساتھ مختص اور مخصوص ہیں‘ ان میں وہ شریک نہیں کیے جاسکتے۔اور سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس مملکت میں جو اس آئیڈیالوجی کی بنیاد پر متشکل ہوتی ہے جو نان ممبرز ہیں ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہیں قائم کیے جاسکتے‘ رازدارانہ تعلقات قائم نہیں کیے جاسکتے۔اسی لیے کہا کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡكٰفِرِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ اَتُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ عَلَيۡكُمۡ سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا (4:144)۔یہاں منفی اور مثبت دونوں چیزیں آ گئیں۔یہ جو رفاقت کے‘ دوستداری کے‘ سرپرستی کے‘ دمسازی کے‘ ہم آہنگی کے باہمی تعلقات ہیں یہ صرف اس جماعت کے ممبرز کے ساتھ ہونگے جنہیں مومنین کہا ہے‘ نان ممبرز کے ساتھ یہ تعلقات قائم نہیں ہوسکیں گے۔اس آیت میں کہا ہے کہ ایسا کبھی نہ کرو کہ مومن سے ورے ہی تم ان غیر ممبران (غیر مسلم) کو اپنا دوست رازدار بنالو۔

کوئی غیر مسلم جماعتِ مومنین کا خیرخواہ نہیں ہوسکتا کیوں؟ اور مسلم مملکت کے دولوازمات:

یہاں تو صرف اتنی سی چیز ہی کہی ہے‘ اس سے پہلے تو بڑی ہی تفصیل سے اس کے متعلق چیزیں آچکی ہیں۔سورۃ آل عمران میں آپ دیکھ چکے ہیں‘ درس میں وہ آیت آچکی ہے کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ (3:118) اے جماعت مومنین! اپنوں کے علاوہ کسی کو اپنا رازدار نہ بناؤ‘ اپنے رازداروں میں شریک نہ کرو۔سیدھی سی بات ہے کہ اگر کوئی نان ممبر یا کوئی غیر مسلم آپ کے شریک حکم ہوتا ہے‘ شریکِ حکومت ہوتا ہے‘ آپ کی مملکت کے امور کے اندر برابر کا شریک ہوتا ہے تو اس سے کوئی راز چھپا ہوا نہیں رہ سکتا‘ اور کوئی راز چھپایا بھی نہیں جاسکتا۔قرآن مجید کا یہ حکم ہے کہ يٰٓاَيُّهَا

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا (3:118) یاد رکھو! یہ کتنے ہی تمہارے اپنے کیوں نہ بنیں، وہ تمہاری تباہی میں، تمہاری تخریب میں، کوئی کمی نہیں کریں گے۔ اور بات ٹھیک ہے۔ آپ کو ایک زندگی کا نظریہ پسند ہے، اس کے مقابلے میں وہ جو دوسرے ہیں، آپ سے متضاد نظریۂ حیات کے قائل ہیں، اب دو متضاد کششیں یک جا جمع کر رہے ہیں۔ آپ کے دین کا تقاضا ان کے تقاضوں سے بالکل مختلف و متضاد ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے یہ کہا ہے کہ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ (3:118) جو چیز تمہارے لیے وجۂ تکلیف اور باعثِ مصیبت ہوتی ہے، اس سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ جب دو مفادات میں ٹکراؤ ہوگا تو ایک کے لیے جو چیز مفاد کا باعث ہوگی دوسرے کے لیے تکلیف کا موجب ہوگی۔ اس قسم کے متضاد عناصر کو ملا کر قوم نہیں بنایا جا سکتا، ان عناصر کو شریکِ حکم کیا ہی نہیں جا سکتا، ان کے بنیادی مقاصد الگ الگ ہیں، متاع الگ الگ ہیں، نصب العین حیات جداگانہ ہیں، ایک مشرق کی طرف جانا چاہتا ہے، دوسرا مغرب کی طرف جانا چاہتا ہے، آپ انہیں یکجا اکٹھا کیسے کر دیں گے۔ کہا ہے کہ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (3:118) ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی تو بے ساختگی کے عالم میں ان کے منہ سے وہ باتیں نکل جاتی ہیں جن سے تمہیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کیسے دشمن ہیں لیکن جو کچھ تمہارے خلاف یہ دلوں میں چھپا کر رکھتے ہیں، تمہیں ان کا پتہ ہی نہیں ہوتا۔ سارے قرآنِ کریم میں آپ دیکھیں گے کہ یہی حقیقت چلی آئے گی اور یہی بنیاد تھی۔ جیسا میں نے کہا ہے کہ اس مملکت پاکستان کے حصول کی دو ہی چیزیں تھیں۔ ایک یہ دو قومی نظریہ ہے کہ مسلمان اپنے ایمان کی بنیاد پر، ہر غیر مسلم سے الگ ایک قوم ہے، غیر مسلم اس قوم کا فرد نہیں ہو سکتا اور دوسری یہ کہ اس مملکت کی ضرورت اس لیے ہے کہ یہاں خدا کے قوانین کو نافذ کیا جائے۔

مملکتِ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ہماری نظریاتی زندگی کی زبوں حالی

ہم نے مملکت تو حاصل کر لی لیکن یہ دونوں چیزیں اس طرف سے نظر انداز ہوئیں نسیًا منسیًا ہوئیں کہ آج انہی پر حرف گیری ہو رہی ہے۔ یہ تو دہرایا جاتا رہا کہ اسلامی مملکت بنے گی اور آج تک وہ الفاظ تو بہرحال دہراتے چلے گئے، تیئیس سال [1] ہو گئے ہیں ہم سنتے چلے آ رہے ہیں لیکن یہ جو دوسری چیز تھی کہ مسلمان ان سے الگ ایک قوم ہیں، یہاں پہنچنے کے بعد اس کا تو نام ہی کسی نے نہیں لیا۔ یہ جو اقامت دین کے اتنے بڑے مدعی بنے پھرتے ہیں انہوں نے بھی اس تیئیس سال [1] میں اپنے ہاں کبھی یہ نہیں کیا کہ یہ شرط ہے کہ غیر مسلم، مسلم قوم کا فرد نہیں ہو سکتا۔ مسلم اور غیر مسلم سارے اکٹھے ہو کر جمہوریت لیے پھر رہے ہیں بلکہ انہوں نے تو پچھلے الیکشن کے دوران یہ کہہ دیا تھا کہ ہم مسلم لیگ کے کسی ممبر کے مقابلے میں ایک ہندو کو ترجیح دیں گے۔ یہ اسلامی مملکت بنانے کے دعویدار ہیں اور جو اس کے مدعی نہیں تھے بہرحال نام وہ بھی یہ لیتے تھے۔ جتنے آپ کے ہاں یہ آئین بنے ہیں، کسی میں یہ بنیادی شرط نہیں تھی کہ یہاں پاکستان کے اندر جو قوم ہے وہ مسلمان کی قوم

---

[1] یاد رہے یہ بات جنوری 1971ء کی 24 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

ہے، نان مسلم اقوام کے افراد نہیں ہیں۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو آئے دن کفر کے فتوے لگتے رہتے ہیں، آج تو وہ مذاق بن کر رہ گئے ہیں، ان کا کوئی عملی مفہوم ہی نہیں رہ گیا۔

اسلامی مملکت میں غیر مسلم افراد کی حیثیت کے تعین کی وضاحت

کسی کو کافر قرار دینے کے سلسلہ میں اسلامی مملکت کے اندر یہ بہت بڑی چیز ہوتی تھی۔ اس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ وہ اس قوم کا ممبر فرد نہیں ہے۔ اس میں ایک تو یہ تھا کہ یہ کسی مُلّا، مولوی، مفتی کا کام نہیں تھا کہ کسی کو مسلم اور کسی کو کافر قرار دیدے۔ یہ تو مملکت کا کام تھا کہ یہ Constitutionally (آئینی طور پر) بتائے کہ کون اس قوم کا فرد ہوسکتا ہے، کون نہیں ہوسکتا۔ اور جو نہیں ہوسکتے، ان کے معنی آج کی اصطلاح میں یا Constitutionally (آئین کے لحاظ سے) یہ تھے کہ وہ فرد Disfrenchise (نمائندگی یا حق رائے سے محروم) ہوجاتا تھا، وہ Disqualify (نااہل) ہوجاتا تھا، وہ آپ کی پارلیمان کا ممبر نہیں بن سکتا تھا، وہ آپ کا ووٹر نہیں ہوسکتا تھا، وہ آپ کی حکومت کے امور میں شرکت نہیں کرسکتا تھا۔ یہ جس کو آپ کفر کا فتویٰ لگا دینا کہیں وہ اس لیے تھا کہ وہ نان ممبر ہوجاتا تھا۔ کفر کے کے فتوے کے یہ معنی ہیں کہ آپ اس کو اپنی سوسائٹی سے خارج کردیتے ہیں لیکن یہاں تو کسی Constitution (آئین) میں بھی یہ بات نہیں آئی، آج کسی کی زبان پہ یہ بات نہیں آئی۔ پہلی بنیاد یہ تھی۔ اور اسلامی مملکت بنانے کی دوسری جو بنیاد تھی ابھی وہ آیت بھی آتی ہے تو میں عرض کرونگا۔ یہاں بہرحال یہ کہا ہے کہ: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (4:144) اے جماعت مومنین! تمہارے رفیق صرف وہی ہونے چاہئیں جو تمہاری جماعت کے افراد ہوں۔ اس لیے تم ایسا کبھی نہ کرو کہ کفار کو مومنین سے ورے ہی اپنا دوست اور کارساز بنالو۔ یاد رکھو! وہ خالصتاً آئیڈیالوجی کی Basis (بنیاد) پہ جماعت بنتی ہے، جو اس آئیڈیالوجی میں Believe (یقین) نہیں کرتا، وہ تمہارا دوست نہیں ہوسکتا۔ ہمیں بھلا ان سے کیا واسطہ جو تجھ سے ناآشنا رہے۔

دوقومی نظریئے کی قرآنی آئیڈیالوجی کو پیش نظر نہ رکھنے والوں کو وارننگ

برادرانِ عزیز! آگے دیکھیے کہ اس کی تہدید کتنی بڑی ہے! کہا ہے کہ: أَتُرِيدُونَ أَن تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا (4:144) کیا تم ایسا کرنا چاہتے ہو، ایسا کروگے تو اس کے بعد پھر خدا کو تمہارے اوپر اپنا غضب اور عذاب نازل کرنے کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہے گی، تنہا یہ ایک دلیل کافی ہوجائے گی کہ تم نے اپنوں کے سوا دوسروں کو اپنا دوست، رازدار، شریکِ حکم، شریکِ مملکت بنایا، اپنی قوم کا فرد تسلیم کرلیا۔ کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ غور کیجیے عزیزانِ من! لیکن آپ کا قرآنِ حکیم تو آج صرف جان [1] نکالنے کے لیے رہ گیا ہے۔

یہاں ذکر منافقین کا آرہا تھا اور میں نے گزارش کیا تھا کہ اگرچہ قرآنِ حکیم کافروں اور منافقوں دونوں کو ایک

[1] سورۃ یٰسین اس آخری وقت پڑھنے کی رسم اس بات کی غماز ہے

کیٹگری (شق) میں رکھتا ہے لیکن جو منافقین ہیں ان کے لیے کہا ہے کہ: اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ (4:145)۔ ذہن میں یہ آتا ہے کہ جہنم میں جو سب سے بڑا عذاب ہے' وہ بہر حال کفار ہی کو ہوگا لیکن یہاں (4:145) میں قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جہنم کے سب سے نچلے درجے کے اندر منافق ہوگا۔ غور فرمائیے! آج تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی' اس لیے کہ ہمیں پتہ نہیں کہ مومن کون ہوتا ہے' تو منافق کا کیا پتہ چلے۔ اور ابھی ابھی یہ بات سامنے آجائے گی کہ یہاں مومن ہے کون۔ قرآن کریم نے کہا یہ تھا کہ: وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ (2:8)۔ یہ تھی قرآن کریم کی رو سے منافق کی Definition (تعریف)۔ ان لوگوں سے جب پوچھیے کہ صاحب! آپ کون ہیں' وہ کہیں گے کہ الحمدللہ مسلمان ہوں من یقولوا کبھی اس سے انکار نہیں کریں گے کہ نہیں صاحب! میں مسلمان نہیں ہوں۔ سوچئے تو سہی کہ ہم میں سے کوئی بھی' کبھی بھی' یہ انکار کرتا ہے' یہ کہتا ہے کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔ کیفیت یہ ہو چکی ہے' وہ لوگ یہاں موجود ہیں' ہمارے سامنے جو تنہائیوں میں بیٹھے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ کیا خدا' کیا رسول ﷺ' کیا ایمان! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ وہ یہ بالکل نہیں مانتے' دہریئے ہیں اور ان چیزوں کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن جب بھی مردم شماری کے رجسٹر والا آتا ہے تو مسلمانوں کے خانے میں نام رکھاتے ہیں۔ کبھی باہر ان سے پوچھ لیجیے' کبھی نہیں کہیں گے کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ منافق میں جرأت نہیں رہتی۔ کفر اور الحاد اور دہریّت کے لیے تو بہت بڑے جگر کی ضرورت ہے۔ معاشرہ میں علی الرغم اٹھ کر کھڑے ہو کر یہ کہنا کہ ہم تم میں سے نہیں ہیں' اس کے لیے جرأت کی ضرورت ہے لیکن ان کی کیفیت یہ ہے۔

منافق کے سلسلہ میں نفسیاتی طور پر ہر آن جہنمی کیفیت میں مبتلا رہنے کی ایک قرآنی مثال

یہ آیات ذرا آگے چل کر آ رہی ہیں جہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وہ لوگ بھی تمہیں ملیں گے جو ظاہر یہ کریں گے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ آگے اس نے بتایا ہے کہ پھر ٹیسٹ کونسا ہے جہاں سے پتہ چلے کہ یہ ایمان نہیں رکھتے۔ یہاں تو منافق کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ جہنم کے عذاب کی پست تریں گہرائیوں میں ہونگے' جہنم کے سب سے عمیق غاروں کے اندر ہونگے' ہر وقت مسلسل جہنم میں ہونگے۔ عام مثال کے مطابق یوں کہیے کہ اگر ایک اسامی کے لیے بی اے ہونے کی شرط ہو تو ایک Candidate (امیدوار) فی الحقیقت بی اے ہے' وہ آیا' وہ سلیکٹ ہو گیا' وہ آ گیا' اطمینان ہو گیا۔ اس کے برعکس ایک امیدوار بی اے نہیں ہے' اس نے کہا کہ میں بی اے نہیں ہوں' انہوں نے کہا کہ تم نہیں لیے جا سکتے' ملازمت نہیں ملی' وہ چلا گیا' معاملہ ختم ہوا۔ اس ملازمت کی جو مراعات یا مفادات ہیں ان سے تو وہ محروم ہوا' دل میں کوئی آگ تو نہیں رہی۔ اب ایک امیدوار ہے' وہ بی اے نہیں ہے' آ کر کہتا یہ ہے کہ میں بی اے ہوں' وہ سلیکٹ (منتخب) ہو جاتا ہے۔

آپ سوچئے کہ یہ جو ملازمت کے (مثلاً) تیس سال ہی نہیں' اس کے بعد بھی اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ قرآن مجید کہتا ہے کہ يَحۡسَبُوۡنَ كُلَّ صَيۡحَةٍ عَلَيۡهِمۡ (63:4) کہیں پتا کھڑکا اور اس کی جان گئی کہ پکڑا گیا' پتہ چل گیا کہ میں بی اے نہیں

ہوں۔ ملازمت کی مراعات تو ملی ہوئی ہیں، ہوسکتا ہے کہ بہت بڑے عزت کے مقام پہ بھی ہو، اس میں پھنے خاں بھی بن چکا ہو❶ لیکن ہر وقت دھڑکا لگا ہے کہ ذرا کسی کو پتہ چل گیا تو پوچھو نہیں پھر کیا ہوگا۔ یہ ہے مسلسل جہنم۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ: نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ ۙ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَۃِ ؕ (104:6-7) اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو لپیٹ لیا کرتی ہے۔ جہنم کا یہ ہے درکِ اسفل۔ میں نے (اوپر مثال میں) کہا ہے کہ کافر کی صرف محرومی ہے، اس کو صرف یہ مراعات حاصل نہیں ہوئیں۔ ایک دفعہ اس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں نے یہ اسامی نہیں لینی، بہر حال وہ نہیں ہے، کچھ اور سوچ لے گا۔ یہ جو بی اے نہیں تھا اور اس نے کہا تھا کہ میں ہوں، اس کی ساری زندگی جہنم کے عذاب کے اندر گزرتی ہے۔

ہندوؤں کے بالمقابل آزادی کے بعد نظریاتی طور پر ہم مسلمانوں کی پیچیدہ صورت حال کی بنیادی وجہ اور اس کا حل

ذرا سوچئے کہ کس عذاب میں ہماری قوم جکڑی ہوئی ہے۔ آزادی ہندو کو بھی ملی، ہمیں بھی ملی۔ اس نے پہلے دن سے یہ فیصلہ کرلیا کہ مذہب کو حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہاں سیکولر نظام ہوگا، مذہب ذاتی پرائیویٹ معاملہ ہے، ہر ایک کو اپنے اپنے پرائیویٹ معاملے کی آزادی ہوگی، جس طرح سے جی چاہے وہ کریں، ہم اس میں دخل نہیں دیں گے لیکن امورِ مملکت کے اندر مذہب کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ دوسرے ہی سال Constitution (آئین) بھی بن گیا اور وہ اس نظام پر چلے جا رہے ہیں، کوئی پیچیدگی نہیں، کوئی مشکل نہیں، کوئی دشواری نہیں، کوئی Demonstration (مظاہرہ) نہیں، کوئی تحریک نہیں، کچھ نہیں۔ یہاں آپ کے ہاں تیئیس سال❷ ہوگئے آئین سازی کے مسئلے میں، بھنور میں، آپ کی امت پھنسی ہوئی کشتی کی طرح ہے، آگے ایک قدم ہی نہیں چل سکتے۔ کیا ہوا؟ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (2:8) انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہم اس ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور قانونِ مکافاتِ عمل اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے، دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی مملکت بنے گی۔

ماڈرن طبقے پر مذہب پرست طبقہ کا اعتراض اور پھر ان کی اپنی کارگزاری کی روداد

اب اس کے بعد دونوں کیٹگریز (شقیں) ہیں، مذہب پرست طبقہ، ماڈرن طبقے کو ہمیشہ کوستا رہتا ہے کہ یہ اسلامی مملکت نہیں بننے دیتے۔ چلئے! ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ یہ نہیں بننے دیتے، اگر ان کی طرف آجایئے جو اسلام کے مدعی ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو یہاں اسلامی مملکت بنا کر رہیں گے، تیئیس (23) سال❷ تک یہ کہتے چلے آئے کہ یہ اسلامی مملکت بنے گی اور اس میں کتاب وسنت کے مطابق قوانین نافذ کریں گے۔ کچھ تو وہ تھے کہ جنہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ مذہب پرست طبقے میں اکثریت ان کی ہوتی ہے جنہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ ہوتا چلا آرہا ہے، کرتے چلے جارہے ہیں، وہ تو یوں ہوتا

❶ آج (2011ء میں) قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران میں اس کی مثالیں موجود ہیں لیکن سوچے کون؟

❷ یہ یاد رہے کہ یہ بات 24 جنوری 1971ء کو کئی گئی تھی۔

ہے کہ اِنَّاۤ وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ (43:22) متواتر ماں باپ سے ایک روش چلی آ رہی ہے کہ ہم نے اپنے آباؤاجداد کو اس روش پر چلتے دیکھا ہے وہ اسے دہرائے چلے جارہے ہیں لیکن وہ بھی تھے جنہیں اس کا پتہ تھا کہ ایسا نہیں ہوسکتا اور وہ مسلسل کہتے چلے جارہے تھے۔قرآنِ کریم ان کے بارے میں کہتا ہے کہ یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (2:9) خدا کو اور جماعت مومنین کو بھی دھوکا دے رہے تھے۔ جب بھی کبھی ایسا موقعہ آیا' ٹیسٹ کیس آیا' بنانے کی بات آئی' وہیں سے چھل دے کر کسی طرف سے نکل گئے۔منافق تو بنیادی طور پہ کہتے ہی اس کو ہیں۔آپ کو پتہ ہے کہ''ن ف ق'' اس کا مادہ ہوتا ہے۔ یہ جو جنگلی چوہا ہوتا ہے' یہ ایک طرف سے بل بناتا ہے اور اس کے اندر جا کر اسی وقت دوسرا راستہ' پہلے سے کھود کر رکھ لیتا ہے کہ کہیں اِدھر سے خطرہ ہوا تو جھٹ سے اُدھر سے نکل گیا۔منافق کے معنی ہوتے ہیں''کسی جگہ داخل ہونے کے ساتھ ہی یہ سوچ لے کہ باہر جانے کا راستہ کونسا ہے''۔''او پہلاں ای فیصلہ کرلوے ایس چیز دا کہ کوئی گل نئیں نکل جاواں گا''(وہ پہلے ہی اس چیز کا فیصلہ کرلے' انتظام کرلے کہ کوئی بات نہیں' میں نکل جاؤں گا)۔ یہ جو ان چیزوں کے مدعی بنے پھر رہے تھے انہوں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ نکلنے کا راستہ کونسا ہے۔

قرآنی قوانین کی بجائے فرقہ بندی کی بنیاد پر فقہ حنفی رائج کرنے کی تجویز

اب جو وقت آیا' ٹیسٹ کیس آیا کہ صاحب! اب نئے آئین بننے والے ہیں اور اب تو راستے کی کوئی چیز روک نہیں ہے' نہ کوئی ڈکٹیٹر ہے' نہ کوئی آمریت ہے' نہ کوئی اس قسم کے لوگ ہیں' جمہوریت کی بنا پہ تم خود حکومت بناؤ' اب آؤ اسلامی قوانین بناؤ۔ یہاں پہنچنے کے بعد انہیں اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ نہیں صاحب! کتاب وسنت کی بنیادوں پہ تو آئین نہیں بن سکتا۔ ارے! کیا کہہ رہے ہیں آپ!!! تیئیس سال تک تو تم نے دہائی دے رکھی تھی' پھر اب کیا ہوگا؟ کہنے لگے کہ صاحب! فقہ حنفی رائج کرلیجیے۔انہیں معلوم تھا کہ جو غیر حنفی لوگ ہیں' وہ اس کو Accept (قبول) نہیں کریں گے۔کیا آپ نے کبھی ان چیزوں پر غور کیا کہ یہاں کیا ہورہا ہے؟ یہ یہاں اسلامی آئین نہیں بننے دینا چاہتے۔اور یہ اس لیے ہے کہ اس میں مذہبی پیشوائیت باقی نہیں رہتی۔کون ایسا ہے جو اپنا کاروبار بند کرادے گا۔آپ غور کیجیے کہ یہ کیا چیز ہوئی؟ کہ صاحب! کوئی نہیں ہے' یہاں اکثریت حنفیوں کی ہے اس لیے کہا کہ فقہ حنفی رائج کردی جائے گی۔انہیں معلوم ہے کہ جونہی یہ بات کہی تو غیر حنفی اٹھ کھڑے ہونگے اور ہوا بھی یہی کہ باقی اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہم اس کو اسلامی مانتے ہی نہیں ہیں۔آپ ہم سے یہ اسلامی منوا کس طرح سکتے ہیں۔ یہ بھی جانتے تھے کہ نہیں منوا سکتے۔ان سے کہا کہ پھر کیا بات ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی فقہ آجائے۔ان کی فقہ اپنی ہے' وہ فقہ حنفی کیسے مان سکتے ہیں۔آپ غور کیجیے کہ انہوں نے کس مقام پہ کھڑا کیا ہوا ہے۔اب یہ جو تیسرا آئین آپ کے ہاں زیرِ تشکیل ہے' اس میں پہلا ایشو یہ آنا ہے۔اگر کوئی یہ نہ لائے تو سارے ملک میں آگ لگا دی جائے کہ مملکت کو اسلامی بنانا ہے' ہم نے اس کو اسی چیز کے لیے حاصل کیا تھا۔یہ کہتے ہیں کہ ہم نے حاصل کیا تھا حالانکہ یہ سب سے زیادہ مخالفت کررہے تھے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اسی مقصد کے لیے حاصل کیا تھا کہ اسلامی بنے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ یہ

حاصل ہی اسی لیے کیا گیا تھا۔ اور اگر وہ اس کو رکھ لیں تو اس کے بعد کیا رکھیں گے۔ عزیزانِ من! غور کیجیے یہ درک اسفل کتنا بڑا ہے! آپ ایک قدم آگے نہیں چل سکتے، سچ تو یہ ہے کہ یہ چلنے ہی نہیں دے رہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک مومن اور کافر کی تخصیص

قرآنِ حکیم نے تو ایک ہی بات کہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ مومن اور کافر میں فرق کیا ہے۔ آپ سوچئے۔ کہا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ (2:8) اس نے تو تخصیص کی ایک ہی لائن کھینچی تھی کہ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ (5:44) سیدھی سی بات ہے جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ کتاب اللہ کا آج بھی نام لیجیے تو آپ دیکھیے آپ کے خلاف کیا کچھ ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے تو مومن کی Definition (تعریف) یہی کی ہے کہ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرنے والے مومن ہیں۔ اس کو چھوڑ کر اس کے علاوہ کچھ دوسرا جو کرنے والے کافر ہیں۔ اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔ آج بھی کہہ کر دیکھ لیجیے، یہ کبھی نہیں آنے دیں گے۔ سوچیے تو سہی کہ پھر اس ملک کا کیا بنے گا۔ کہا ہے کہ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ (2:8) جو دعویٰ کرتا چلا جائے کہ یہ اسلامی مملکت بنے گی اور اسلامی مملکت بنانے کے لیے جو خدا نے ایک بنیادی شرط قرار دی ہے، اس سے انکار کرتا چلا جائے اور کہے نہیں، میں انکار کر رہا ہوں۔ آپ ہر وقت ان کی زبانوں پر کتاب اللہ، قرآنِ حمید، ماانزل اللہ دیکھیں گے، یہ مَنۡ يَقُوۡلُ ہے، یہ کہے چلے جائیں گے لیکن وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ (2:8)۔ انفرادی طور پر تو میں نے اوپر مثال میں عرض کیا تھا کہ اپنی ایک چیز کو چھپا کر، کچھ بن کر، دوسری چیز لینے والا، وہی جو نان گریجویٹ تھا جس نے بی اے بن کر اسامی حاصل کر لی، وہ ملازمت کے سارے دورانیے میں کس جہنم میں گزرا۔ اور اجتماعی طور پر آپ دیکھ لیجیے کہ ہماری یہ مثال ہے۔ اس چیز کا دعویٰ ہے اور ایمانداری سے اس پر کوئی نہیں آرہا۔ یہ نہیں ہے کہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس آیت کے معنی کس کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ چار ہی تو الفاظ ہیں۔ یہ کہا ہے کہ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ (5:44)۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پوری قوم بھگولے کے رقص کی طرح بپھری ہوئی ہے، کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کیا جائے۔ اس مشکل کے اندر پھنسی ہوئی ہے۔ غالب (1797-1869ء) کے الفاظ میں یہ ہے کہ

ہے دلِ شوریدہ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کِس مشکل میں ہے

اگر کسی نے دنیا بھر میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار کرنا ہو تو اپنے قول و عمل میں تضاد پیدا کر لے

کہا ہے کہ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ‌ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لَهُمۡ نَصِيۡرًا (4:145)۔ اپنی یہ حالت

ہے اور یاد رکھو! جو بھی کسی اپنے قول و عمل میں مخلص نہیں ہے، دنیا میں اس کا کوئی مددگار نہیں ہوا کرتا۔ کیا بات کہہ گیا ہے قرآنِ پاک! بھکاری کی طرح خیرات کے ٹکڑے تو تمہاری جھولی میں کوئی ڈال دیں گے، وہ بھی اپنے مقاصد کی خاطر ہونگے۔ دوست کوئی نہیں ہوگا، مددگار کوئی نہیں ہوگا، ناصر کوئی نہیں ہوگا۔ (جواہر لال) نہرو (1964-1889ء) جیسے کافر نے یہ بات لوٹا کر کہہ دی تھی جب اس نے اس وقت کہا تھا جب آئے دن آپ کے ہاں حکومتیں بدلا کرتی تھیں۔ اس سے کہا تھا کہ جا کر Treaty (معاہدہ) کرو تو اس نے کہا تھا کہ کس کے ساتھ Treaty (معاہدہ) کروں۔ معلوم نہیں کہ وہ کل کہاں ہو، ان کے تو قول و فعل کا اعتبار نہیں ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ وَلَنۡ تَجِدَ لَهُمۡ نَصِيۡرًا (4:145) ان کا کوئی رفیق اور مددگار نہیں ہوسکتا۔ اپنے کون ہوسکتے ہیں۔ سنیے، عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے چار الفاظ میں بات کی ہے۔ کہا ہے کہ اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا (4:146) اپنے وہ ہیں جو اپنی روش سے باز آ جائیں۔

صحیح منزل پر پہنچنے کا طریق

پہلی چیز تو یہ ہے کہ تم نے اس دوراہے سے جو غلط قدم اٹھایا تھا تم وہاں لوٹ کر واپس آ ؤ۔ اسی راہ پر چلتے چلے جاؤ گے تو ہر قدم تمہیں منزل سے دور لیتا جائے گا۔ اس دوراہے کے اوپر واپس جاؤ جہاں سے تم نے غلط قدم اٹھایا تھا۔ کہو، اس بات کو تسلیم کرو کہ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ (5:44) جو بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہ کافر ہیں۔ یہی بنیاد ہے۔ وہاں واپس آ جاؤ۔ کیا اس دوراہے پہ واپس آنے سے منزل تک پہنچ جاؤ گے یہ کہہ کر کہ صاحب! چار گھنٹے کا سفر تھا، چار گھنٹے تو ہم نے چل لیا، بلکہ ہم نے تو آٹھ گھنٹے چل لیا، واپس بھی تو آئے ہیں۔ کہتا ہے کہ نہیں! یہ تو صرف غلطی کی تلافی ہوئی جو تم نے کی تھی۔ بات اب یہاں سے شروع ہوئی ہے۔ کہا ہے کہ وَاَصۡلَحُوۡا (4:146) آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کرلو۔ اب صحیح سمت کی طرف قدم اٹھاؤ۔ اس نفاق سے نہیں کہ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ (2:85) ان میں سے جو چیزیں اپنے مفیدِ مطلب ہوئیں وہ لے لیں اور دوسری چیزوں کو چھوڑ دیا۔

مذہب کی افیون کا علاج دین کو مضبوطی سے اپنانے ہی میں ہے

کہا ہے کہ وَاعۡتَصَمُوۡا بِاللّٰهِ (4:146) حبل اللہ کو محکمیت سے، مضبوطی سے تھامو۔ وَاَخۡلَصُوۡا دِيۡنَهُمۡ لِلّٰهِ (4:146) اپنی اطاعت اور فرماں پذیری کو اپنے نظامِ سلطنت اور نظامِ حکومت کو، اپنے دین کو، خالص اللہ کے لیے کرو۔ یہ کرو گے تو فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (4:146) پھر تم مومنین کی جماعت میں شامل ہوسکو گے۔ اور جب یہ ہوگا تو وَسَوۡفَ يُؤۡتِ اللّٰهُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَجۡرًا عَظِيۡمًا (4:146) پھر تم دیکھو گے کہ اس اجرِ عظیم میں شریک ہو جائیں گے جو قانونِ خداوندی کی رو سے عنقریب جماعتِ مومنین کو ملنے والا ہے۔ یہاں سَوۡفَ ہے، یہ کوئی لمبی تاریخ یہاں نہیں پڑے گی کہ عاقبت میں ہی جا کر تمہیں کچھ ملے گا، کہا ہے کہ اس کے فوراً بعد تم دیکھو گے کہ اس کا کتنا بڑا عظیم اجر ملتا ہے! یہ جو تم اس عذاب میں مبتلا ہو

اوراس کے لیے پھر تمہیں یہ افیون پلا دی جاتی ہے کہ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ (29:21) اللہ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ (48:14) جسے چاہتا ہے مغفرت کر دیتا ہے۔ پھر یہ وعظ ہوتا ہے کہ صاحب! یہ تو اللہ کی شان ہے جسے چاہے عذاب دیدے‘ جسے چاہے مغفرت کردے:

اوتھے کی پروا اے راکب! اوتھے بے پروائیاں

پھڑ لے عملاں والیاں نوں‘ چھڈ دے اوگنہار نوں

یہاں پہنچنے کے بعد یہ چیز ہے کہ قوم اگر ذلت اور عذاب کے اندر ہے تو اس میں کسی کا بس نہیں ہے بھئی! یہ تو یہ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ہے اللہ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مَا یَفۡعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمۡ اِنۡ شَکَرۡتُمۡ (4:147) اگر تم اس طرح سے ایمان لاؤ اور اقدار کی قدردانیاں کرو تو ہم نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے۔

دوسروں کو تکلیف پہنچا کر خوش ہونا ایک خطرناک نفسیاتی مرض ہے

سائیکولوجی میں ایک نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے‘ اسے Sadism (اذیت پسندی) کہتے ہیں یعنی دوسرے کو تکلیف پہنچا کر خوش ہونا۔ یہ جتنے مستبد چنگیز اور ہلاکو اور یہ اس قسم کی شخصیتیں تاریخوں میں ملتی ہیں‘ ان کا Analysis (تجزیہ) یہ ہے کہ وہ Sadistic (اذیت پسند) تھے۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے دوسرے کو تکلیف پہنچا کر خوش ہونے کی اور اگر چنگیز اور ہلاکو کا قوت اور اختیار حاصل ہو جائے تو پھر تو آپ سمجھ لیجیے کہ وہ کیا کچھ کریں گے۔ وہ جو پہلے بادشاہوں کی باتیں سنتے ہیں کہ کوئی ان کے خلاف ہوا تو ٹھیک ہے بھئی! اس کو قتل کرا دیجیے‘ وہ یوں قتل نہیں کراتے تھے۔ جس جس عذاب سے اس کو قتل کراتے تھے وہ تھا کہ اندھے کنویں میں ڈالے ہوئے ہیں‘ بڑے بڑے چوہے وہاں چھوڑے ہوئے ہیں‘ بچھو اور سانپ چھوڑے ہوئے ہیں‘ بھوک سے بھی مار رہے ہیں‘ ہاتھیوں کے پاؤں تلے ان کو روندوایا جا رہا ہے‘ کھالیں کھنچوائی چلی جا رہی ہیں‘ الٹا لٹکوایا ہوا ہے۔ ایسے بادشاہ گزرے ہیں جو اپنا تخت اس جگہ بچھواتے تھے جہاں اردگرد اندھے کنوؤں کے اندر ان دشمنوں کو ڈالا ہوتا تھا اور ان کی سسکیاں اور آہوں کی آوازیں آتی تھیں۔ جس دن یہ آوازیں کم ہو جاتی تھیں‘ اس دن داروغے کو حکم ہوتا تھا کہ یہ کیا ہوا‘ آج آوازیں کم آ رہی ہیں‘ اس کے اندر اس قسم کے لوگ نئے تازے ڈالو[1]۔ یہ ایک ذہنیت ہو جاتی ہے۔

عزیزانِ من! اب سوچیے کہ اگر یہ ذہنیت ہو تو میں تو ہلاکو اور چنگیز تک ہی رہتا ہوں کہ قوت وہ ہو‘ قوت ہو خدا کی اور معاذ اللہ ہو وہ کالی دیوی۔ آپ کو پتہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے ہاں کالی دیوی ہوتی ہے۔ اس کے گلے میں انسان کی کھوپڑی کے ہار ہوتے ہیں۔ یہ ہوتی ہے Sadistic Mentality (اذیت پسند ذہنیت)۔ ان کی نفسیات میں یہ کیفیت تھی کہ ان کے ورن کا ہندو‘ نیچے ورن کے ہندو کو دبا کے‘ گلا گھونٹ کے‘ خوش ہوتا تھا‘ ان کا خدا جو تھا وہ کالی دیوی ہوتا تھا‘

---

[1] آج بھی طاقتور قومیں اپنے مخالفین سے یہی سلوک کرتی ہیں صرف انداز مختلف ہے‘ ذہنیت تو وہی ہے۔

کالی بھیرو ہوتا تھا۔ یہاں تو اب نہیں ہیں' پتہ نہیں' انڈیا میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ سرخ رنگ کی اس کی زبان نکلی ہوئی ہوتی تھی' اس کی بھیانک ڈائن جیسی شکل ہوئی تھی' اس کے چار پانچ ہاتھ ہوتے تھے اور گلے میں انسانوں کی کھوپڑیوں کا ہار یا وہ انسان کی لاش کے اوپر کھڑی ہوئی ہیں اور ان کے ہاتھ میں کنڈی سی تھی' اس میں اس کو چبھویا ہوا ہے' خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں' دیوی یا دیوتا خوش ہو رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ہو نفسیاتی کیفیت' کسی کی Mentality (ذہنیت) کی اور قوت اور اقتدار ہو لا منتہا' تو توبہ توبہ ہی بھلی!

اللہ تعالیٰ کی کبریائی تو ان تصورات سے کہیں بلند ہے

خدا کے صحیح تصور کے بارے میں کہا ہے کہ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ (4:147) تم اگر ان چیزوں کی قدردانی کرو جو ہم نے تم سے کہی ہیں تو ہم نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے۔ آہاہا! یہ بڑی عجیب چیز ہے! یہ ہے وہ خدا۔ کہا ہے کہ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ (4:147)۔ یہ کچھ کہنے کا کتنا حسین انداز ہے! اوسوچو تو سہی' تمہیں تکلیف پہنچا کر ہمیں کرنا کیا ہے مگر یہاں تو مرے کو مارے شاہ مدار۔ سچ یہ ہے کہ جو خود ہی مر رہا ہے اس کو اگر مارا تو کیا مارا۔ کہا ہے کہ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ (4:147) صحیح اقدار حیات پہ ایمان لاؤ اور اس کے لیے بھرپور کوششیں کرو۔ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (4:147) تم شکرگزار بنو تو ہم تمہارے لیے شاکر بنیں گے۔ کیا بات ہے!

دوسروں کے سابقہ Career (پیشے' کام) کو معاشرے میں مت پیش کرو:

اب آگے ایک اور بات آئی۔ یہ منافقین کا ذکر آ رہا تھا' ان سے کہا تھا کہ اگر یہ اپنی روش چھوڑ کر یہ کچھ باتیں اختیار کر لیں تو پھر تمہیں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اس کے بعد ان کا جو Past Career (عہد ماضی کا پیشہ' کام) ہے' اس کے متعلق تشہیر کرتے پھرو کہ ہاں! ہمیں وہ دن یاد ہیں' ان کی کیفیت یہ تھی' یہ لوگ ایسے تھے۔ کہا ہے کہ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ (4:148) ہم قطعاً اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ تم ان چیزوں کا چرچا کرتے پھرو۔ اور انہی کے متعلق نہیں' خود معاشرے کے متعلق بھی یہ چیز کہو کہ انفرادی طور پہ کسی کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ جس چیز کو ناپسند سمجھتا ہو اس کے متعلق Demonstration (مظاہرہ) شروع کر دے۔ دہائی دینا شروع کر دے' نہیں' ہم قطعاً اسے پسند نہیں کرتے۔

اپنی پسند کو دوسروں سے باور نہ کروانے کی شکل میں انہیں بدنام نہ کیا جائے

یہ ٹھیک ہے کہ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (4:148) ہاں' البتہ جس پر ظلم ہوا ہو' وہ ظلم کی تو فریاد کر سکتا ہے لیکن اگر اس پر ظلم نہیں ہوا ہے' کوئی بات ہے' جو اسے ناپسند ہے تو یہ بات غلط ہے کہ تم دوسروں کے خلاف ان کی تشہیر کرتے پھرو۔ معاشرے کے اندر تو قرآنِ کریم نے خاص احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کو کہا ہے۔ اسی سورۃ میں ذرا پہلے کہا ہے کہ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ (4:83) معاشرے میں فتنہ پروری کی ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کا مقصد اور منصب یہ رہ

جاتا ہے کہ کسی طرح معاشرے میں خلفشار پیدا کرتے چلے جائیں' انتشار پیدا کرتے چلے جائیں' فساد برپا کرتے چلے جائیں' نہ کسی کو سکون سے بیٹھنے دیں' نہ کسی کو معاشرے میں چین سے بیٹھنے دیں۔ ان کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے۔

بغیر تصدیق کیے کسی کی بات کو آگے مت پھیلاؤ

عزیزانِ من! ان کی کیفیت یہ ہے کہ جونہی کوئی بات' کہیں سے' پہنچی تو انہوں نے دہائی دینا شروع کر دی۔ کہا کہ ہو سکتا ہے کہ فی الواقعہ وہ بات صحیح ہو' اس کے نتائج و عواقب معاشرے کے لیے بڑے ہی نقصان رساں ہوں۔ ہاں! وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (4:83) کرو یہ کہ اگر کوئی ایسی بات آئے تو جو اربابِ اختیار و اقتدار ہیں' جو ذمہ دار لوگ ہیں' ان تک جا کر رپورٹ کرو تا کہ وہ تحقیق کر لیں' پھر کسی صحیح نتیجے پہ پہنچیں' اس کے مطابق مناسب اقدامات کریں۔ کہا کہ یہ طریقہ ہونا چاہیے۔ اب یہاں تو یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ ''اک پَر دیاں ڈاراں بنا ندے ہیگے نیں'' (ایک ہی پَر کو بڑھا چڑھا کر پرندوں کا غول بنا دیتے ہیں) یعنی کسی چڑیا کو دیکھا' کہا کہ وہ ڈار ہوتی ہے۔ وہ جھنڈ کے جھنڈ پرندے بناتے ہیں' ذرا سی چیز ہوتی ہے وہ اسے اتنا بڑا ابھار دیتے ہیں۔ ہم اس مقام پہ پہنچ گئے ہیں کہ ''پر وی نئیں ہوندا' تے ڈاراں بنن دیاں ہو یاں ہوندیاں نیں'' (ایک پر بھی وہاں نہیں ہوتا مگر ان کے نزدیک غول کے غول بن رہے ہوتے ہیں)۔ کل ہی آپ نے یہ تماشا دیکھا جو ہمارے ہاں ہوا تھا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ حضور ذات رسالت مآب ﷺ کی ذات اقدس و اعظم ﷺ اتنی بلند ہے کہ حضور ﷺ کی تعظیم و تکریم و احترام کے لیے تو اس سے زیادہ اور کوئی کیا کہے گا کہ ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' حضور ﷺ کی ذات اقدس میں کسی قسم کی جو اہانت و گستاخی ہے' وہ کبھی مومن برداشت نہیں کر سکتا لیکن یہ بھی تو خدا کا حکم ہے کہ اگر کوئی ایسی چیز آئے تو اس کے متعلق' جو ذمہ دار ارباب ہیں' ان تک وہ بات پہنچایئے' وہ مناسب تحقیق کریں' وہ پھر اقدامات کریں جو کچھ کرنا ہے۔ اور اگر کیفیت یہ ہو جائے کہ جس کا جی چاہے وہ اس چیز کو لے اڑے اور پھر تخریبات کی یہ کیفیت ہو کہ توڑ پھوڑ کرو' آگ لگاؤ' یہ کرو وہ کرو۔ اس طرح معاشرے میں کبھی امن قائم نہیں رہ سکتا۔

عزیزانِ من! یہ سارا کچھ ہونے کے بعد' کل کے اخبار میں جو نکلا ہے وہ آپ احباب نے پڑھا ہو گا۔ وہ ایک ''کتاب'' ہے جس کے متعلق ساری دہائی دی گئی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کوئی چار سو سال ہوئے' ترکی میں ایک شخص تھا' اس نے یہ کتاب لکھی تھی' وہ اسی زمانے میں مر بھی گیا' اور یہاں یہ ہو رہا تھا کہ کوئی کہتا تھا کہ مصنف انڈین نیشنل ہے' کوئی کہتا تھا کہ برٹش نیشنل ہے' اس کو پکڑو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کے متعلق کہیں سے گستاخی کا کلمہ سننے سے ہمارا دل تڑپ کیوں نہ اٹھے لیکن دل کی تڑپ کے یہ معنی نہیں کہ ہم خود خنجر ہاتھ میں لے لیں۔ قرآنِ حکیم یہ کہتا ہے کہ جب کبھی ایسی بات ہو تو اسے ذمہ دار احباب تک پہنچایئے' وہ بھی تو وہی ہیں جن کے سینوں میں وہی دل ہے جو اس بات پہ ہم سے بھی زیادہ تڑپ اٹھے گا لیکن اس سے جو کیا جائے گا اس سے معاشرے کا نظام نہیں بگڑے گا اور جو اقدام کیا جائے گا وہ Effective (مؤثر و کارآمد) ہو گا۔ اور اگر یہ نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنا معاشرہ تو تباہ ہو جاتا ہے اور وہ جو

اصل مقصد ہوتا ہے وہ اس کے بعد مفقود ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے تو ہمیں اس کی تلقین کی ہے۔

عزیزانِ من! دوسری جگہ ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا (49:6) جب بھی کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو یونہی اس کے پیچھے نہ جاؤ' اس کی چھان بین کرو۔ اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ (49:6) کہیں ایسا نہ ہو کہ تم یونہی اٹھ کر جذبات میں یہ فساد انگیزیاں شروع کر دو' اپنی تباہیاں کر لو اور اس کے بعد افسوس ہو کہ ہم نے یہ کیا کر دیا۔ اسی ضمن میں قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا (4:148) خدا یہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ جو چیز تمہیں ناپسند ہو' ناگوار گزرے' تم اس کی تشہیر شروع کر دو' دہائی دینی شروع کر دو' Demonstration (مظاہرہ) شروع کر دو' فساد برپا کرو۔ نہیں' قطعاً ایسا نہیں کرو۔ جس پہ ظلم ہوا ہے' وہ اپنے ظلم کی فریاد کرے اور اگر اس قسم کی کوئی خبر پہنچی ہے تو ذمہ دار ارباب تک پہنچایئے۔ ان کا کام ہے کہ وہ دیکھیں کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ آگے کہا ہے کہ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا (4:148) یہ جو اللہ ہے' جس کے نام پہ حکومت قائم ہوتی ہے' اس کے یہ فرائض ہو جاتے ہیں' وہ حکومت سمیع و علیم ہوتی ہے' صحیح تہ تک پہنچنے کے لیے اس کے پاس بہت سے ذرائع ہوتے ہیں' انہیں صحیح تہہ تک پہنچنے دو۔ باقی رہا یہ کہ کسی کے متعلق جو اچھی بات ہے' ٹھیک ہے کہ اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ (4:149) اس کا تم چرچا بھی کر سکتے ہو' اس کو تم ویسے بھی رہنے دے سکتے ہو لیکن جو چیز معاشرے میں فساد کا موجب بنتی ہے' تم اس کا چرچا نہیں کر سکتے۔ یہ بھی چیز ہے کہ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ (4:149) کبھی کوئی برائی تمہارے خلاف ہوئی ہے' اسے درگزر کر کے تم آگے بھی بڑھ سکتے ہو۔ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا (4:149) یاد رکھو! خدا میں دونوں چیزیں موجود ہیں' وہ قدیر بھی ہے کہ اس نے اس کے لیے قانون بھی بنا رکھا ہے' وہ عَفُوًّا (4:149) بھی ہے کہ اگر وہ دیکھتا ہے کہ یونہی اصلاح ہو سکتی ہے تو پھر وہ یونہی آگے بڑھ جاتا ہے۔

لفظ عَفُوًّا کا لغوی اور قرآنی مفہوم ''درگزر کرنا'' ہے اور بابا جی دی اللہ میاں نال چلدی اے ذرا

یہ عَفُوًّا عجیب لفظ ہے' اسے ہم معافی کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں ''کسی بات سے آگے بڑھ جانا' جسے درگزر کہتے ہیں''۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ تمہارے نظام میں یہ دونوں چیزیں ہونگی کہ اگر وہ ایسی فتنے کی صورت نہیں ہے اور اس میں اصطلاح کا امکان ہے تو اس میں وہ معاف کر دے گی' اگر ایسی صورت نہیں ہے تو قانون کے شکنجے میں لے آئے گی لیکن انفرادی طور پہ' تم اس طرح سے Law (قانون) کو اپنے ہاتھ میں مت لو۔ یہاں وہ بات آئی ہے۔ یہ منافق یا کافر کی بڑی اہم چیز آئی ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ (4:150) جو لوگ خدا اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں یا خدا کو تو مانتے ہیں کہ کارگہٗ کائنات میں اس کے قوانین جاری و ساری ہیں لیکن جہاں تک انسانوں کی دنیا کا تعلق ہے وہ اس قانون سے انکار کرتے ہیں یا اس کے قانون کو مانتے ہیں تو اس طرح کہ کسی

ایک رسول کی طرف نازل شدہ قانون کے من جانب اللہ ہونے کو تسلیم کیا اور دوسروں کی تکذیب کر کے اللہ اور اس کے رسول میں تفریق پیدا کی اور اس طرح یہ صرف ''اللہ اور رسول'' پر ایمان ہے۔ یہ قرآن حمید کے کئی ایک مقامات میں آیا ہے۔

عزیزانِ من! جب جھکڑ آتا ہے تو انسان کپڑوں کو اپنے ساتھ سمیٹ لیتا ہے۔ جب خاموشی سے حرارت آتی ہے تو خود انہیں اتار کر رکھ دیتا ہے۔ معاشرے میں جھکڑ نہیں پیدا کرنے چاہئیں' سورج کی سی خاموش حرارت پیدا کرنی چاہیے۔ مثلاً ''ان'' کا یہ مکالمہ سنیے۔ صبح اتنی ٹھنڈ تھی' ہم نے وہ سائبان نہیں لگایا' انہوں نے کہا کہ بابا جی! بارش نہیں ہو رہی ''فصلاں سُک گیاں حال برا ہو ریا اے'' (فصلیں خشک ہو گئیں' بُرا حال ہو رہا ہے)۔ ''کہن لگے اچھا! اے ساڈی جھلّی جیہڑی ہیگی اے کل دھوتی سی' ایہنوں باہر دھپے پا دیو'' (کہنے لگے کہ اچھا! یہ جو ہماری گدڑی ہے' اسے کل دھویا تھا اسے خشک ہونے کے لیے دھوپ میں ڈال دو)۔ ''کہن لگے: پتہ نئیں باہر دھپے اوہدے نال کی تعلق اے' آیا بدل' کڑا کڑ مینہ وسنا شروع ہو یا' اوہناں نے کہیا کہ بابا جی! ایہدے اچ کی راز اے؟ کہن لگے: آج کل ساڈی اللہ میاں نال چلدی اے ذرا[1]''۔ یہ اندازوں کی غلطی ہے' عزیزانِ من! اس کے ہاں تو ہر چیز قانون کے مطابق ہوتی ہے۔

انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ قوانینِ فطرت کو تو مانتا ہے لیکن وحی کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات کو تسلیم نہیں کرتا

کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ (4:150)۔ عزیزانِ من! میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ یہ بڑی اہم چیز آئی ہے۔ قرآنِ کریم میں کئی مقامات پہ یہ ہے کہ جب ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے بنایا ہے تو کہیں گے کہ خدا نے بنایا۔ ان سے کہو کہ اس خارجی کائنات کے نظام پر کس کی قدرت ہے' سورج کون چڑھاتا ہے' ہوائیں کون چلاتا ہے؟ کہیں گے کہ یہ سب کچھ خدا کرتا ہے۔ اس کے بعد کہا کہ یہاں تک تو تم خدا کو مانتے ہو اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کی دنیا میں خدا کے قوانین کو مانو تو اس کے بعد کہا ہے کہ فَاَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ (43:87) ''تہانوں فیر کی موت پے جاندی اے ایتھے آ کے'' (یہاں آ کر پھر تمہیں کونسی موت پڑ جاتی ہے)۔ یہ ہے خدا کا ماننا۔ عزیزانِ من! اگر خدا کے قانون کو نہیں مانتا ہے تو خدا پہ ایمان لانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ وہ دہریہ جو بالکل ہی نہیں مانتا' وہ بھی قوانینِ فطرت کو مانتا ہے اور یورپ کا مادہ پرست تو ہم سے بھی زیادہ خدا کو مانتا ہے' وہ تو ان قوانین کی صداقت پر اس طرح سے علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتا ہے' اس چیز کا روز مشاہدہ کرتا ہے' نام چاہے کچھ اور رکھ لے۔ اور جو اس طرح سے وہاں انکار نہیں کرتے وہ سب خدا کو مانتے ہیں' بڑے بڑے سائنٹسٹ کی کم از کم آخری عمر کی کتابوں کو دیکھیے' وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے تجربات کی بنا پر خدا

---

[1] کہنے لگے: معلوم نہیں کہ باہر دھوپ میں' اس کا' اُس کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ بادل آیا کڑاکے دار' بارش برسنا شروع ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ بابا جی! اس میں یہ کیا راز ہے؟ کہنے لگے: آج کل ہماری اللہ میاں سے لگی ہوئی ہے' اللہ میاں سے چل رہی ہے۔

کو مانتے ہیں۔ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) کونسی بات ہے جس کی وجہ سے وہ خدا کو ماننے والے نہیں کہلا سکتے۔ خدا کے ماننے کے معنی یہ ہیں کہ میری جو زندگی ہے' وہ خدا کے قوانین کے تابع چلے گی' خدا کا ماننا خدا کے قوانین کو ماننا ہے۔

خدا کے ماننے یا نہ ماننے کا تمام تر دار و مدار حیات انسانی کے لیے دی گئی راہنمائی پر ایمان لانے پر موقوف ہے

اور یہ قوانینِ خداوندی انسانوں کے ذہن کے پیدا کردہ نہیں ہیں' وہ رسول ﷺ کی وساطت سے ملتے ہیں اس لیے رسول ﷺ پہ ایمان نہیں لایا جاتا تو خدا پر ایمان بے معنی ہوتا ہے۔ یہ قرآن کریم یہود اور نصاریٰ اور ان تمام لوگوں کو جو خدا کو مانتے تھے' اپنے اپنے نبیوں کو بھی مانتے تھے' کیوں تاکید کر رہا ہے کہ تمہیں اس رسول ﷺ پر ایمان لانا ہوگا اور اس کتاب پر ایمان لانا ہوگا۔ اس لیے کہ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جو ضابطۂ حیات دیا ہے' اس کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے ورنہ یونہی خارجی کائنات کے اندر آسمان پر بیٹھے ہوئے خدا کی کارفرمائی کو مان لینا' نہ مان لینا' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ایک کہتا ہے کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا' دوسرا کہتا ہے کہ نہیں! یہ خود وجود میں آ گئی۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ فرق یہ پڑتا ہے کہ ایک کہتا ہے کہ میری زندگی' میرے فیصلوں کے تابع چلے گی بلکہ یوں کہیے کہ میرے فیصلوں نہیں' پارلیمنٹ کے فیصلوں کے تابع چلے گی' قوم کے' عوام کے' فیصلوں کے تابع چلے گی اور اس کے باوجود جا کر مسجد میں نماز بھی پڑھتا ہے' یہ خدا پہ ایمان نہیں ہے۔ ایمان وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ میری ساری زندگی خدا کے دیئے ہوئے قوانین کے تابع چلے گی' یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ملے گی۔ یہ ہے خدا پر ایمان۔

برہموسماجی طریق کا پروگرام اور اس کا نتیجہ

مختلف مذاہب کے باہمی سرپھٹول کو دیکھ کر ہمارے ہاں برہموسماجی [1] ایک فرقہ پیدا ہوا تھا اس کا بانی راجہ رام موہن رائے تھا۔ اس نے یہ بات کہی تھی کہ صاحب! یہ سب چیزیں اس لیے ہو رہی ہیں کہ تم الگ الگ مذاہب رکھے ہوئے ہو۔ اس نے کہا تھا کہ تمام مذاہب کی اچھی اچھی باتوں کو اکٹھا کر لیا جائے۔ گویا یہ کہ مذاہب میں اچھی باتیں بھی ہوتی ہیں' بری بھی ہوتی ہیں۔ مذاہب میں تو یہ ہوتا ہی ہے اس لیے کہ وہاں تو خدا کے پیغامات میں تحریف ہو چکی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ تمام مذاہب کی اچھی اچھی باتوں کو جمع کر لیا جائے اور اس کو اپنے لیے ضابطہ بنا لیا جائے' باقی رہا خدا سے تعلق تو کسی نے مندر میں گھنٹی بجالی تو کیا' کسی نے گرجے میں بل (Bell) بجالی تو کیا' کسی نے اذان دے لی تو کیا۔ یہ بات تو ذاتی خدا سے تعلق کی ہے۔ اچھی اچھی باتیں اکٹھی کر لی جائیں۔ اس کا بڑا چرچا ہوا کہ صاحب! یہ بہت اچھا ہے۔ یہ چار دن بھی نہیں چل سکا اور یہ بات صاف ہے۔ ہم کم از کم جتنے مسلمان ہیں یا دنیا بھر کے جتنے بھی صاحب شعور لوگ ہیں' ان میں یہ جتنے بھی جنہیں ہم Universal

---

[1] ہندوؤں کا مکتبۂ فکر جس کی بنیاد 1830ء میں راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں رکھی تھی۔

Moral Laws (عالمگیر ضابطۂ قوانین) کہتے ہیں' آپ عالمگیر ضابطۂ اخلاق کہتے ہیں مثلاً سچ بولو' جھوٹ نہ بولو' فریب نہ دو' چوری نہ کرو' زنا نہ کرو' کسی کو نہ ستاؤ' یہ ساری دنیا میں Common (مشترک) ہیں۔ اس کے باوجود ساری دنیا میں یہ ہو کیا رہا ہے؟ یہ اس چیز پہ ایمان نہیں ہے کہ یہ چیزیں مستقل اقدار ہیں جن کے تابع زندگی بسر کرنا میرا ایمان ہے۔

قرآنی ضابطۂ حیات پر ایمان زندگی کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کرتا

عزیزانِ من! اسے ایمان بالرسالت کہتے ہیں جس میں خدا کی کتاب پہ ایمان شامل ہوتا ہے۔ خدا کو ایک Personal God (تجسیمی خدا) مان لینا' اس کے ساتھ میرا ذاتی تعلق ہے اور جو اعمال حیات ہیں ان کو اپنے قانون کے تابع' اپنی مرضی کے تابع' ملک کے قانون کے تابع' رکھ لینا' یہ خدا پہ ایمان نہیں ہے' یہ تفریق بین اللہ وبین الرسل ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم اللہ میں اور اس کے رسولوں میں تفریق کرتے ہو حالانکہ جس کو رَسُوْلَہٗ کہا ہے' خدا کا پیغامبر کہا ہے تو پیغام بھیجنے والے میں اور اس پیغام میں فرق کرنا یعنی وہ جو بھیجنے والا ہے' اس کو آپ نے مانا کیا ہے؟ اس کے ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پیغام کو' پیغام لانے والے کو' مانیئے۔ یہ اس طرح کا Personal God (شخصی ساخدا) ہے' یہ اس کا تصور ہی وہاں پیدا ہوا تھا جب سیکولر نظام حکومت اپنے ہاں رائج کیا کہ جو Personal (شخصی) معاملات ہیں ان کے اندر تو تم جانو' تمہارا خدا جانے اور دوسری طرف جتنے بھی امور دنیاوی ہیں' جو امور مملکت ہیں وہ ہمارے اپنے باہمی مشورے سے طے ہونگے اور اس کا انہوں نے نام رکھا ہے خدا پر ایمان۔

تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں مخالفت کرنے والے علما کے متعلق علامہ اقبالؒ کا ارشاد

وہاں انڈیا کے اندر یہی چیز تھی جو پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں میں اور اس کی مخالفت کرنے والے مسلمان علما میں مابہ النزاع تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں ہندوستان میں مذہب کے عقائد کی' رسومات کی' عبادات کی' اجازت ہے مگر جو ملکی قوانین ہیں وہ ملک کے ہونگے۔ اس کہنے والے (اقبالؒ) نے اس کے خلاف کہا تھا کہ

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ اللہ اور رسول ﷺ کے اندر تفریق تھی۔ مسلمانوں کے معاشرے کے اندر بھی جو لوگ تھے وہ اس کی جرأت تو نہیں کرتے کہ وہ اعلانیہ یہ کہہ دیں کہ خدا سے ہمارا کوئی تعلق نہیں' ہم نہیں مانتے۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ معاشرے کے اندر رہتے ہوئے یہ کہنے کی بڑی جرأت ہے۔ یہ جرأت یہاں کس کو نصیب ہے۔ یہاں وہ لوگ موجود ہیں جو فی الواقعہ خدا کے ان قوانین کے تابع' قرآنِ کریم کے تابع' نہیں رہنا چاہتے' وہ قرآنِ حکیم کو مانتے ہی نہیں ہیں کہ یہ بھی کوئی وحی کی چیز ہے' اس میں ابدی حقائق ہیں' ابدی قوانین ہیں' اس پر ان کا ایمان نہیں ہے مگر ان کی دشواری یہ ہے کہ نہ کرنہیں سکتے۔ آپ کو پتہ ہے کہ وہ خدا پرستی کی شہادتیں کس طرح سے دیتے ہیں؟ عُرسوں پہ چلے جائیں گے' داتا صاحب کے مزار پہ چلے جائیں گے' بلھے شاہ

کے ملنگ بن جائیں گے۔ یہ سارا کچھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ معاشرے کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہم دہریئے نہیں ہیں۔ لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! دیکھیے کہ وہ تو عقیدت مندی کی بڑی انتہا ہوتی ہے جو ان قبروں پہ چلا جاتا ہے' وہاں چلا جاتا ہے۔ یہی فرار (Escapism) تو تصوف ہے۔ نظامِ دنیا کو چھوڑ دینا کہ جس قسم کے جی چاہے یہاں قوانین نافذ ہوتے رہیں' اپنا تعلق خدا کے ساتھ یوں وابستہ کر لینا۔

کہا ہے کہ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (2:9)۔ یورپ کا ہر بڑا اسائنٹسٹ جو خارجی دنیا میں خدا کو ماننا چلا جا رہا تھا' آپ دیکھیں گے کہ آخر میں آکر ان میں سے ہر ایک اس کانسپٹ (منکر) ہو گیا۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ ہے خدا کو ماننے کا عملی ثبوت۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ لوگ جن کی عام زندگیاں ہر قسم کے عیوب میں' ہر قسم کے معائب میں ہوتی ہیں' جو قانون شکنیوں کے اندر ہوتے ہیں' جو اسمگلر ہوتے ہیں' جو جوئے باز ہوتے ہیں' وہ سب سے زیادہ قبروں پہ جانے والے ہوتے ہیں' وہ اس طرح خدا پر اپنے ایمان کا ثبوت دے رہے ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ میں تفریق کفر ہے۔

عزیزانِ من! کیا کہنے ہیں اس کتاب کے! یہ تو کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑتی۔ اللہ اور رسول ﷺ کا ماننا کیا ہے؟ رسول ﷺ کے ذریعے جو پیغام ملا ہے' اس کو زندگی کا عملی ضابطۂ حیات قرار دینا ہے۔ یہ ہے اللہ پر ایمان۔ جب اس نے کہا تھا کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) وہ لوگ ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اس ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے لیکن وہ درحقیقت ان پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ یہ لوگ تھے جو اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (4:150) بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ فرق کرتے ہیں اور اس طرح اقرار اور انکار کے بین بین ایک تیسری راہ اختیار کرنے کی سوچتے ہیں۔

ہر امت رسول کی نسبت سے تشکیل پاتی ہے

اب آگے اس میں دو تین باتیں کہی ہیں' کہیں تو یہ صورت ہے کہ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ (4:150) ان رسولوں میں سے جو آتے رہے' ان میں سے بعض پر کہتے ہیں ہم ایمان لائے' بعض کو کہتے ہیں کہ ہم انکار کرتے ہیں۔ یہودی حضرت عیسیٰؑ سے پہلے تک کے نبیوں پہ ایمان لانے کے لیے مطمئن ہے' یہودی' عیسائی ہو جاتا ہے جب وہ حضرت عیسیٰؑ پہ بھی ایمان لے آتا ہے۔ وہاں پھر وہ مطمئن ہو گیا۔ ٹھیک ہے' وہاں تک تو ٹھیک تھا' اس کے بعد نبی اکرم ﷺ تشریف لے آئے۔ نبی اکرم ﷺ سے انکار مگر پہلے تمام انبیاء پر ایسے اقرار کو قرآنِ کریم اقرار نہیں مانتا۔

آخر پھر ختم نبوت کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے

یہاں سے ضمناً ایک اور بات سامنے آ گئی۔ بڑا آسان مسئلہ ہے کہ جو روز ہمیں درپیش ہوتا ہے کہ آیا یہ مرزائی مسلمان ہیں یا نہیں' یہ امت محمد ﷺ کے افراد ہیں یا ان کو الگ امت کے افراد قرار دیا جائے؟ یہ بڑی آسان سی بات ہے۔ امت بنتی کس طرح سے ہے؟ ایک یہودی حضرت عیسیٰؑ سے پہلے کے تمام نبیوں کو مانتا ہے' وہ موسوی امت کا قائل ہے' حضرت

موسیٰؑ کو اپنا نبی مانتا ہے' جس دن وہ حضرت عیسیٰؑ کو نبی مان لیتا ہے' وہ عیسائی ہوجاتا ہے' یہودی نہیں رہتا' اس آخری نبی جس کو اس نے مانا ہے' اس پہ ایمان لانے سے اس نبی کی امت کا فرد ہوجاتا ہے۔عیسائی' عیسائی رہتا ہے جب تک رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لاتا' جس دن وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آتا ہے وہ عیسائی نہیں رہتا' مسلمان ہوجاتا ہے یعنی وہ اب امت عیسوی کا فرد نہیں رہا' امت محمدیہ ﷺ کا فرد ہوگیا۔ یاد رکھو! رسول کی نسبت سے امت بنتی ہے۔اور اگر رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور نبی پر ایمان لے آیا تو جس طرح عیسائی رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے عیسائی نہیں رہتا اسی طرح مسلمان آپ ﷺ کے بعد کسی نبی پہ ایمان لانے سے' آپ ﷺ کی امت میں تو نہ رہا بلکہ اس نئے نبی کی امت میں سے ہوگیا۔ بات تو صاف ہے کہ جی! ہم رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہیں' قرآن کریم کو مانتے ہیں۔ یہ ہے بنیاد۔اور جب تک کوئی اس رسول کی امت کا فرد نہیں ہوتا تو اس کے لیے خدا پر ایمان لانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔عزیزانِ من! یہ فریب ہے' فرار ہے' گریز ہے' قرآنِ حکیم اسے کفر کہتا ہے۔کہا ہے کہ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ (4:150) وہ کہتے ہیں کہ ہم ضابطۂ قوانین کی ایک بات پر ایمان لاتے ہیں اور دوسری سے انکار کرتے ہیں۔ پھر یہ ایک ہی رسول یا ایک ہی رسول کی کتاب میں سے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے انکار ہے۔

مسلمان ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ کو من حیث الکل تسلیم کیا جائے

قرآنِ حکیم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) کیا اس کتاب کی بھی تم یہ کیفیت کرتے ہو کہ اس کے کچھ حصے پر ایمان لے آؤ اور کچھ حصے سے انکار کردو یعنی اسے بھی آپ کو من حیث الکل لینا ہوگا۔کچھ حصہ تو ایک طرف اگر آپ پاکستان کے ضابطۂ قوانین میں سے کسی ایک کے متعلق یہ کہہ دیں کہ میں اس سے سرکشی (یعنی جرم اور چیز ہے کہ اس کی خلاف ورزی آپ سے ہوجائے) اختیار کرتا ہوں' اگر آپ یہ کہیں کہ میں اس حکومت کو اس کا (مجاز) Competent نہیں مانتا کہ وہ اس قسم کا قانون بنا سکے اور نافذ کرسکے تو یہ بغاوت ہے۔

آپ اس مملکت کے نیشنل (شہری) نہیں رہ سکتے جس کے قانون کے متعلق آپ یہ چیلنج کردیں کہ اس باب میں یہ میری مملکت نہیں رہی۔اس لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ کیا کرتے ہو کہ ضابطۂ قوانین کے ایک حصے پہ ایمان لاتے ہو' اور دوسرے سے انکار کرتے ہو۔کہا ہے کہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85) ایسی روش اختیار کرنے والے جو دوغلے ہیں' ان کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت وخواری ہوگی' عاقبت کا عذاب تو اس سے کہیں زیادہ شدید ہوگا۔ضابطۂ حیات کو تو کلی ماننا ہوگا یا کلی انکار ہوگا۔کہا ہے کہ اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (2:208) پورے کا پورا اس میں داخل ہونا ہوگا۔منافق یہ کرتے ہیں کہ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا (4:150) بین بین کی راہ اختیار کی جائے

نہ تو پورے کا پورا انکار کیا جائے' نہ پورے کا پورا اقرار کیا جائے۔ صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں۔ عزیزانِ من ! یہ جو چلمنی پردہ ہے یہ منافقت ہے' اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ یہاں Percentage (فی صد) کا حساب نہیں ہے کہ کوئی نہیں صاحب! 33% تو حاصل کر لیئے' پاس مارکس ہو گئے۔

یہاں تو ہر Subject Compulsory (مضمون لازمی) ہے۔ سارے Optional (اختیار مضامین) سے آپ 100% مارکس لے کر ایک Compulsory Subject (لازمی مضمون) میں' ایک نمبر سے فیل ہو جائیے' آپ پورے امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں۔ خدا کی طرف سے ضابطۂ ہدایت کا ہر مضمون Compulsory (لازمی) ہے۔

صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر بین بین راستے پر چلنے والا مسافر کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکتا

کہا ہے کہ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا (4:150) بین بین کی راہ اختیار کرتے ہو۔ سنیئے! عزیزانِ من! کہا ہے کہ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا (4:151) خدا کو مان رہے ہیں' بعض رسولوں کو بھی مان رہے ہیں' کچھ حصہ جو ہے اس پہ ایمان بھی ہے' کچھ حصے پر کچھ عمل بھی ہے' باقی ماندہ کو چھوڑ دیا ہوا ہے۔ میں نے جیسا کہا تھا کہ ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ چلیے بہرحال اتنے Percent (فی صد) مارکس تو مل ہی جائیں گے۔ وہ کافر ہی نہیں کہہ رہا ہے بلکہ کہہ رہا ہے کہ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا (4:151)۔ اس میں فریب کی گنجائش تھی اس نے فریب کو توڑنے کے لیے یہ حَقًّا کہہ کر ''ایہڈا اوڈا وِدان ماردتا اے۔ تہاڈی ایسی دی تیسی'' (اتنا بڑا ہتھوڑا مار دیا ہے۔ تمہیں ملامت کر دیا ہے)۔ کہا ہے کہ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا (4:151) اس قسم کی روش اختیار کرنے والے جو کافر ہیں' ان پہ جو عذاب آتا ہے' وہ رسوا کن ذلت آمیز ہوتا ہے۔ یہاں عذاب مھین کہنا کیا بات ہے صاحب! ذلت اور وہ بھی منافقت کی ذلت کا کیا پوچھنا ہے! کہا ہے کہ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ لَمۡ یُفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ اُولٰٓئِکَ سَوۡفَ یُؤۡتِیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا (4:152) ان کے برعکس وہ لوگ جو خدا پر یوں ایمان لاتے ہیں کہ خدا اور اس کے پیغام رسانوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ رسول اور اس کی رسالت' اس کے پیغامات پر ایمان لانا' یہ ہے خدا پہ ایمان لانا' وہ اس میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ ہیں جنہیں تم دیکھو گے کہ بہت جلد ان کی محنتوں کا معاوضہ دیا جائے گا۔ معاوضہ یوں ہوگا کہ ان کی کچھ کمزوریوں' کچھ کوتاہیوں کی حفاظت بھی ہو جائے گی' سامان نشوونما بھی ملتا جائے گا' قوم آگے بڑھتی چلی جائے گی۔

ایمان کی منزل تک پہنچنے کا طریق اور ایمان کے سلسلہ میں اکراہ کا مفہوم

اب یہ رہا کہ ایمان کیسے لایا جائے۔ قرآنِ کریم نے یہ چیز بتائی ہے کہ ایمان کے معنی ہیں ''قلب اور دماغ کو امن نصیب ہو جانا' کامل اطمینان ہو جانا' علیٰ وجہ البصیرت کسی چیز پہ غور و فکر کرنا' اور اس طرح سے اس نتیجے پہ پہنچنا کہ یہ واقعی حق ہے' اس کا نام ہے ایمان''۔ اس میں کسی قسم کا اکراہ نہیں ہے۔ اکراہ وہ ہے جسے ہم زبردستی کہتے ہیں۔ ذہن میں اکراہ ایک ہی

آتا ہے کہ کسی نے ہاتھ میں تلوار لی اور کہا کہ پڑھو کلمہ اور اس کے اس تلوار کے ڈر سے جو کلمہ پڑھ لیا' اسے کہتے ہیں کہ اکراہ ہوا یعنی کسی سے زبردستی کرا لیا۔ یہ تو اکراہ کی بڑی معمولی سی چیز ہے۔

برادرانِ عزیز! اکراہ وہ ہے کہ آپ کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے' آپ سے کوئی بات منوالی جائے اور پھر ایسا چکر رکھا جائے کہ آپ اس سے نکلنے ہی نہ پائیں۔ یہ ہے صحیح اکراہ۔ یہ وہ اکراہ ہے جس کا تعلق قلب و دماغ سے ہے۔ یہاں سے بہت کم نکلا جا سکتا ہے۔ تلوار بزورِ بازو تو محسوس اکراہ ہے۔ اس میں تو آپ دیکھیں گے کہ لوگ نکلے' انہوں نے سر دے دیا لیکن غلط بات نہیں مانی۔ اس قلب و نگاہ کو ماؤف کرنے میں آپ دیکھیں گے کہ قدم قدم پر نظر آ رہا ہے کہ غلط بات ہو رہی ہے مگر عقیدت ہے کہ آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! آپ نہیں جانتے' یہ بڑے دور کی باتیں ہیں' یہ باتیں عالم بالا کی ہیں' وہ اس کے متعلق خوب جانتے ہیں۔ یعنی کامیابی ہو تب بھی وہ مطمئن ہیں' ناکامی ہو تب بھی وہ مطمئن ہیں۔ ایک پروگرام کی ناکامیوں کے بعد نظر آتا ہے کہ یہ جو متبعین کی جماعت ہے' وہاں کھڑے ہو کر یہ سوچے گی کہ نہیں صاحب! وہ پروگرام غلط تھا' اس میں ناکامیاں ہوئیں' وہاں پہنچ کر بھی ان کو وہ اس قسم کا جھنجھنا دیا جاتا ہے کہ وہ ناکامیوں کو کامیابیاں سمجھنے لگ جاتے ہیں ''ایویں ای لوگ رولا پوندے رہندے ہیگے نیں جی' اینوں جتیاں پیاں جتیاں پیاں۔ لوکاں نوں گل کرن لگیاں شرم وی نئیں کتھے اوندے' او جتیاں سن' اپنے اپنے تے بچکانے سن ❶'' لیکن قربان جایئے ماننے والوں کے' وہ بھی مانتے ہیں کہ سبحان اللہ صاحب! واقعی ''اوہنوں جتیاں نئیں سن پیاں پروپیگنڈہ ہو رہیا اے جناب سب کچھ'' (اسے جوتے نہیں پڑے تھے۔ یہ تو جناب! سب کچھ محض پروپیگنڈہ تھا)۔ یہ چیز ہے کہ جس سے قلب و دماغ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر لیا جائے۔ عزیزانِ من! یہ ہے اکراہ' جہاں قوم کو تباہ کیا جاتا ہے۔

کہا ہے کہ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ (4:153) ہم نے کتاب دی' کہا کہ غور و فکر کرو' دیکھو تو سہی کہ کس طرح سے ان چیزوں پہ پورا اترتی ہے۔ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ایسے نہیں' ہم ایمان لائیں گے کہ یہ جو کتاب ہے یہ آسمان سے لکھی لکھائی اترے ''جلد بنی بنائی اتوں تری اون ڈئی ہووے'' (جلد بنی ہوئی اوپر سے نازل ہوئی آ رہی ہو) یعنی ایسے کتاب اتارو تو پھر ہم ایمان لائیں گے۔ دیکھا ذہنیتیں! کرامات کے زور پر تو خدا کو مانیں گے کہ آسمان سے یوں کتاب اتارو۔

حضرت موسیٰؑ سے یہودیوں کا مطالبہ کہ آسمانوں سے خدا کو ہمارے سامنے لاؤ

بعض اوقات تو قرآنِ مجید ایسا جواب دیتا ہے کہ صاحب! پوچھو نہیں' طبیعت میں بشاشت آ جاتی ہے۔ یعنی اس کے متعلق بیسیوں چیزیں اور جگہ آئی ہیں' جواب دیا ہے' یہاں دیکھو۔ یہودیوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ آسمان سے کتاب اتارو فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ (4:153) تم سے تو انہوں نے اتنی سی بات کہی کہ آسمان سے کتاب اتارو مگر اپنے

❶ لوگ یونہی شور مچاتے رہتے ہیں کہ اسے جوتے پڑے جی! لوگوں کو بات کرتے ہوئے کہیں شرم بھی نہیں آتی۔ وہ جوتے تھے' سنو! وہ تو بچگانے تھے!

رسول سے تو اس سے بھی زیادہ مطالبے پیش کیا کرتے تھے یعنی کہا کرتے تھے کہ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰہَ جَھْرَۃً (4:153) خدا کو سامنے بٹھا کر ہمیں دکھاؤ۔ میں نے کہا ہے کہ بعض اوقات تو قرآنِ کریم ایسی عجیب بات کرتا ہے یعنی ان کی ذہنیت بتاتا تھا کہ کیا ہے۔ تم سے تو یہ اتنا ہی کہہ رہے ہیں' اپنے پیغمبر سے تو یہ اس سے بھی بڑی بات کہتے تھے' اس سے کتاب ہی نہیں مانگتے تھے' کہتے یہ تھے کہ خدا اوپر سے ہمارے سامنے آ کر یوں کھڑا ہو جائے' پھر تو ہم خدا کو مانیں گے ورنہ نہیں مانیں گے۔ پھر ہوا کیا؟ کہا کہ فَاَخَذَتْھُمُ الصّٰعِقَۃُ بِظُلْمِھِمْ (4:153) ۔ظلم کے معنی ہیں کہ ''جو شے جہاں ہونی چاہیے' وہاں نہ رکھیں''۔ کتاب کے متعلق یہ نہ سمجھنا کہ یہ عقل وفکر کو اپیل کرنے والی چیز ہے' نبی کے متعلق یہ نہیں کہنا کہ وہ خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات لا کر اس کو چلائے گا' بس یہ سمجھنا کہ کرامات دکھاتا پھرے گا' شعبدے بازیاں دکھاتا پھرے گا۔ اسے قرآنِ کریم نے ظلم کہا ہے۔ چنانچہ اس قسم کی توہم پرستیاں یا اس قسم کے مطالبات جو تھے اس کی وجہ سے اس قوم پر ایک گرفت آئی۔ پھر ہوا کیا؟ آخر اس قوم کی ذہنیت کا نتیجہ کیا ہوا؟

واضح دلائل اور روشن تعلیم کو ٹھکرا کر کرامات دیکھنے والی قوم کا حشر

عزیزانِ من! سوچیے! یہ بات ان یہودیوں کی نہیں ہو رہی' جنہوں نے یہ مطالبے کیے کہ اس قسم کے معجزے دکھایئے۔ وہ معجزات والی بات ختم ہوگئی تو کرامات تک اتر آئے۔ انہوں نے کیا یہ کہ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْھُمُ الْبَیِّنٰتُ (4:153) ایسے واضح دلائل آنے کے بعد ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ سامری نے ایک بچھڑا سا بنایا' اس کے گلے میں ذرا سی خلا رکھی کہ اس میں ہوا جاتی تھی تو وہ سیٹی بجایا کرتا تھا یا آواز نکالا کرتی تھی اور وہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ میں نے کہا ہے کہ جب عقل وفکر ماؤف ہو جائے تو وہ خدا کو اپنے سامنے دیکھنا تو ایک طرف رہا' جب وہ نظر نہیں آتا تو اگر کوئی اتنی سی چیز بھی ان کے سامنے کر دے' وہ اسی پر ایمان لے آتے ہیں' اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ حضرت صاحب جو ہیں' وہ تو بڑی کرامت کے مالک ہیں' ہم نے دیکھا صاحب! کہ انہوں نے ہمارے سامنے یہ بالوں کو پکڑا اور یوں نچوڑا اور اس میں سے دودھ کے قطرے نکل آئے۔ ''او بکری دے دودھ دا پکھا نا ہوندا اے ہتھ اچ رکھیا ہو یا'' (بکری کے دودھ کا غبارہ ہاتھ میں رکھا ہوا ہوتا ہے)۔ بس ہوئے ہیں گرویدہ۔ ''سٹے دے نمبر' جناب! بڑے صحیح دسدا پیا ہیگا'' (سٹے کے نمبر بڑے صحیح بتا رہا ہے)۔

قرآن کریم کی تعلیم انسانوں کی ذہنیت کو تبدیل کر دیتی ہے

قرآنِ حمید ذہنیت کی بات کرتا ہے کہ اتنے اتنے بڑے مطالبوں سے نیچے اترتے ہیں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ذرا سا خلافِ معمول کوئی واقعہ سامنے آیا اور سجدے میں گرے۔

عزیزانِ من! کیا یہی حالت اس قوم کی نہیں ہو گئی ہوئی جنہیں قدم قدم پہ یہ کہا گیا تھا کہ یہاں ذہنی اکراہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے؟ کیا یہ قوم وہاں آتی ہے جہاں عقل وبصیرت کی بنیادوں پہ ذہن میں سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے یا وہاں جاتی ہے جہاں عقل وبصیرت کے تمام سرچشموں کو مفلوج کیا جاتا ہے؟ ہر خانقاہ پہ جانا' ہر قبر پہ جانا' ہر فقیر کے ہاں جانا' ہر صاحبِ کرامات کی باتیں

ماننا' ہر حضرت صاحب کے پاؤں جا کر چومنا' یہ کیا چیز ہے؟ یہ گوسالہ پرستی ہے۔ کہا ہے کہ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ (4:153) اگر وہ بات نہیں دکھائی گئی تو کوئی بات نہیں صاحب! ہم اسے پوچھ لیں گے۔ کہا ہے کہ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ (4:153) او! اس قدر واضح دلائل وبصیرت کی چیزیں تمہارے سامنے آئیں اور اس کے بعد بھی تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اپنے سامنے تمہارے سامری نے یہ گوسالہ بنایا تھا اور صرف اتنی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی کہ صاحب! آواز کیسے نکل رہی ہے اور تم اس کے سامنے جھک گئے۔ پھر یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ وہ صاحبِ شرف انسان کہ جس کے لیے کہا ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (45:13) ساری کائنات تابع تسخیر ہے' وہ انسان پتھر اور چونے کی عمارت پر جا کر سر جھکا رہا ہے جس کے لیے کہا تھا کہ سارے ملائکہ نے اس کے سامنے سر جھکایا۔ یہ مسجود ملائک' پتھروں کے سامنے جا کر ان کا ساجد بنتا ہے۔ اس سے زیادہ ذلت کیا ہوگی۔

ہماری پوری تاریخ قومِ بنی اسرائیل سے مماثل دکھائی دیتی ہے

کہا ہے کہ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ (4:153)۔ اس کے باوجود ہم نے دیکھا کہ قوم میں کچھ صلاحیت ہے تو فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ (4:153) ہم نے ان کی اس حماقت سے بھی درگزر کیا۔ پتہ نہیں ہمارے ساتھ یہ معاملہ بھی ہوگا یا نہیں ہوگا۔ یہاں کہا ہے کہ پھر ہم نے ان کو ایک موقع دیدیا۔ شاید ہندوستان کے مسلمان کو یہ آخری موقع تھا جو پاکستان کی شکل میں ملا۔ عزیزانِ من! بنی اسرائیل کی داستان قدم بقدم ہماری داستان سے ملتی ہے۔ فرعون کی غلامی سے نجات کے بعد سینا کے صحراؤں کے اندر تو اس نے ہمیں لا کر بٹھا دیا اور اب کیفیت یہ ہے کہ ہم نے پھر اپنی پرستش کے لیے گوسالے تراش لیے ہیں' ان کی شکلیں کچھ ہوں' وضع قطع کوئی ہو' شاید اس کے بعد یہ کیفیت ہو کہ جو قرآنِ حکیم نے کہا تھا کہ موسیٰؑ! اس قوم کو چالیس سال تک ان صحراؤں کے اندر سرگرداں پھراؤ تاکہ ان کا نام ونشان مٹ جائے اور یہ جو آنے والی نسل ہے اس کی تعلیم وتربیت کرو۔ اس کی تعلیم صحیح کی تو اس نے ایک جھپٹا مارا' وہ سرزمین جس کے متعلق کہا تھا کہ ہم نے ان کے نام لکھ دی ہے وہ اس قوم کے نصیب میں نہ ہوئی۔ اُنہوں (نئی نسل نے) نے آ کر یہ کچھ لیا۔ یہ تھا جو کہا ہے کہ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ (4:153) ۔اور ہم تو آنے والی نسلوں کی بھی تربیت نہ کر سکے۔ کہا ہے کہ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا (4:153) ہم نے موسیٰؑ کو بڑے کھلے ہوئے دلائل دیئے تھے۔

آگے کہا ہے کہ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (4:154) وہ تو ایک عہد و پیمان کر کے آئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یا اس سے پہلے ہمارے عہد و پیمان کو دیکھیے ہم اس سرزمین کو اس لیے حاصل کر رہے ہیں کہ یا اللہ! یہاں تیری بادشاہت کا تخت جلال بچھے' تیرے قوانین کی حکومت ہو' ہم اس کے تابع چلیں۔ قرآنِ حکیم یہ کہتا ہے کہ ایک طرف طور جیسی ایک آہنی دیوار ان کے پیچھے حفاظت کے لیے ہے کہ ادھر سے کوئی حملہ آور نہ آ جائے' حفاظت کا سامان دیا' وہاں ان سے

عہد و پیمان لیا۔ کہا یہ ہے کہ یہ نئی سرزمین' نئی مملکت' تمہیں دی جا رہی ہے' اس میں تم قدم رکھو۔ اس لیے کہ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا (4:154) قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہوئے آؤ۔ اس کا یہ مقصد تھا۔ کہا ہے کہ ہم نے انہیں اخلاقیات یا ضوابط یا پابندیوں کے متعلق کہا۔

عزیزانِ من! آزادی نام ہے ان پابندیوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ کہا ہے کہ ان سے تجاوز نہ کرنا' ان سے سرکشی اختیار نہ کرنا۔ شروع میں چھوٹی چھوٹی سی باتیں کہیں مثلاً یہ کہ ہفتے میں ایک دن ناغہ کرلیا کرو' سوچو تو سہی کہ یہ کونسی ایسی قیامت ہے یا پابندی ہے۔

اخلاقی لحاظ سے چھوٹی چھوٹی پابندیوں کے سلسلہ میں ہماری بدعملی کا تذکرہ

آپ کو پتہ ہے کہ گوشت کے ناغے والے دن بازار کی طرف جو دروازہ ہوتا ہے اُسے تو بند کر دیا جاتا ہے مگر پچھلی طرف کی جو کھڑکی ہے اسے کھلا رکھا جاتا ہے۔ کہا تھا کہ ایک دن ناغہ کرلیا کرو۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ اس میں بھی چور بازاری کیا کرتے تھے۔ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا (4:154) یہ وہی قوم تھی جو ابھی کل یہ قسمیں کھا کر آئی تھی کہ ہم تیرے قانون کے سامنے جھکیں گے' کیفیت ان کی یہ ہوگئی۔ کہا کہ فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ وَ كُفۡرِهِمۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ وَّقَوۡلِهِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ (4:155) ان کے یہ جرائم تھے وہ عہد و پیمان انہوں نے توڑا' خدا کے قوانین سے انہوں نے سرکشی برتی' انبیا جو حق بات کہنے والے تھے ان کو ناحق انہوں نے قتل کیا۔ جب بھی کسی نے ان سے کہا کہ بھائی! یہ سوچ سمجھ کی بات ہے' اسے سنو تو کہا کہ او جاؤ جاؤ بابا! ہمیں سب معلوم ہے' ہمارے پیالے بھرے ہوئے ہیں' اس میں پانی کا ایک قطرہ اور نہیں پڑ سکتا' ہمارے دل غلافوں کے اندر ہیں اور ہم کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

دلوں پر تالے پڑنے کی وجہ جواز اور پھر انہیں کھولنے کا طریق

کہا ہے کہ بَلۡ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ (4:155) ان کا یہ انکار تھا جس کی وجہ سے ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے۔ اور فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا (4:155) شاید ان میں سے کچھ ایسے نکل آئیں گے جو ایمان لائیں ورنہ ان سے تو کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔

عزیزانِ من! سورۃ النساء کی آیت 155 تک ہم آ گئے' آئندہ 156 ویں آیت سے لیں گے۔ اس کے بعد مضمون بھی دوسرا شروع ہوتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر ہے۔ اسے ہم آئندہ لیں گے۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآنی نظریۂ قومیت

عنوانِ بالا کے تحت لکھا گیا یہ مضمون 16 اگست 2009ء کو ایک تقریب میں پڑھا گیا تھا جو کہ ادارہ طلوع اسلام کے تحت یومِ آزادی کے سلسلہ میں منعقد کی گئی تھی۔ مضمون پڑھنے کے بعد سامعین کی طرف سے کئے جانے والے سوالات کے جوابات بھی محترم ڈاکٹر انعام الحق صاحب نے دیے۔ یہ مقالہ طلوع اسلام کے قارئین کے لئے درجِ ذیل کیا جا رہا ہے۔(ادارہ)

عزیزانِ گرامی قدر! السلام علیکم۔

میں بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا دلی ممنون ہوں کہ انہوں نے یومِ پاکستان کی اس باسٹھویں تقریب میں خصوصی طور پر خطاب کے لئے میرا انتخاب کیا۔ یہ میرے لئے بہت اعزاز اور فخر کی بات ہے۔ عزیزانِ گرامی قدر! یومِ پاکستان کی اس تقریب کے حوالے سے خطاب کے لئے ''قرآنی نظریۂ قومیت'' کا انتخاب کیا گیا ہے۔

کسی حکیم نے بڑے پتہ کی بات کی تھی کہ آپس میں بات چیت کرنے سے پہلے جو الفاظ یا اصطلاحات موضوعِ گفتگو بنیں، ان کا مفہوم واضح ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مقرر اور سامعین کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ ایک ہی مفہوم سے متفق ہوں۔ اس کے بغیر بات مزید آگے نہیں بڑھ سکتی۔

تحقیق کے طالب علم کو پڑھایا جاتا ہے کہ وہ اپنی تحریر یا تقریر میں جو الفاظ یا اصطلاحات استعمال کریں، وہ عصرِ حاضر کے ان مفہوم کو ادا کریں جو علمی حلقوں میں مستند ترین مانا جاتا ہو۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ میں اپنے خطاب کے عنوان کے تینوں الفاظ/ اصطلاحات کا مفہوم بیان کر کے اس میں آپ لوگوں کو شریک کروں۔

پہلے لفظ ''قرآنی'' سے فطرتی طور پر وہی مفہوم لیا گیا ہے جس کی وضاحت خود قرآن نے عربی مبین اور تصریفِ آیات کی رو سے کی ہے۔ دوسری اصطلاح نظریہ کا مفہوم علم کی زبان میں یوں درج ہے۔

(1) حقائق و واقعات، اشیاء و حوادث کو ایک مثالی اور عمومی زاویہ یا رشتہ میں دیکھنا۔

(2) سیاقِ علمی میں کسی مسئلہ سے متعلق معلومات کو ان کے مجرد علائق میں دیکھنا تاکہ مسئلہ کی تفہیم ہو سکے۔

(3) ایک مجرد ضابطہ، عمومی اصول، ماڈل جو کسی مظہر کی توجیہہ کے لئے قبول یا پیش کیا جائے۔

تیسری اصطلاح ''قومیت'' کی اصطلاح Nation بمعنی ملت' قوم سے مراد معاشرتی گروہ لیا جاتا ہے جو ثقافتی لحاظ سے ہم رنگ ہو اور اسے اپنی نفسی زندگی اور اس کے اظہار کی وحدت کا پورا پورا شعور ہو۔ اس کے افراد کے کچھ رشتے قدرتی طور پر اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ وہ اکٹھے خوش کن زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ جدید نظریہ یہ ہے کہ ہر قوم کو اپنی ایک الگ ریاست بنانی چاہئے۔

پہلی تعریف قوم کے تناظر میں سامنے لائی گئی ہے جبکہ قومیت کی اصطلاح کا مفہوم یوں درج ہے۔

''روحانی جذبہ جو ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جن میں نسل کا اشتراک ہو۔ وہ ایک ہی علاقے پر آباد ہوں۔ ان میں زبان' ادب' مذہب' ثقافت' تاریخ' روایات' مفادات' سیاسی روابط اور سیاسی وحدت کا اشتراک ہو۔

عزیزانِ گرامی قدر! ان اصطلاحات کے مفہوم کی وضاحت سے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے موضوع ''قرآنی نظریہ قومیت'' کی طرف لوٹ آئیں اور اس کے نظریہ پاکستان کے ساتھ تعلق پر روشنی ڈال سکیں۔ نظریہ پاکستان کے بارے میں محترم منیر صاحب (ریٹائرڈ) چیف جسٹس آف پاکستان نے اپنی کتاب From Jinnah to Zia کے دوسرے ایڈیشن میں فرمایا ہے کہ قائداعظم پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔

سیکولر کا لفظ شاید ہمارے کچھ احباب کے لئے غیر مانوس ہو۔ لہٰذا میں چاہوں گا کہ اس اصطلاح کا بھی علمی مفہوم سامنے لایا جائے۔ علم میں سیکولر (عصری) سے مراد ہے کہ

(1) لاطینی زبان میں لغوی طور پر جس کا تعلق وقت (تاریخ)' قبیلہ' نسل یا امورِ عالم سے ہو۔

(2) ایسے امور جن کا تعلق عصری زندگی سے ہو۔ سماجی امور و معاملات بمقابلہ پروہتانہ یا کلیسائی امور انتظامی۔

(3) وہ امور مثلاً تعلیم' اخلاق اور شہری یا مملکتی نظم و نسق جو کلیسائی انتظامیہ سے آزاد سمجھے جائیں۔

(4) ارض بمقابلہ ماورائی اور روحانی۔

(5) عام معنوں میں خلاف مذہب (دین)۔

جسٹس منیر کے پاکستان میں قائداعظم کا سیکولر ریاست کے قیام کے دعویٰ کو نظریہ پاکستان کی دونوں مقتدر ہستیوں نے واضح طور پر مسترد کیا ہوا ہے۔ علامہ اقبال کی وضاحت میں ہم ان کے ایک ہی مصرع کو سامنے لا رہے ہیں' جن میں انہوں نے فرمایا کہ: ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسی طرح ہم قائداعظم کے متعدد اقوال کے ذکر کرنے کی بجائے صرف ان کا ایک ہی جامع اور واضح قول درج کر رہے ہیں' جو انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) کے طلباء کو 1941ء میں انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان کے دفاع میں کہا تھا کہ:

''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی

ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں کہ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔''

میں سمجھتا ہوں کہ قائداعظم کے اس دوٹوک اور واضح موقف کے بعد کہ وہ مطالبہ پاکستان اس نظریہ سے کر رہے ہیں کہ وہاں وہ قرآنی نظام کا عملاً نفاذ کر واسکیں' ان سے منسوب بیان کہ وہ پاکستان میں سیکولر نظام کے داعی تھے اس کا متقاضی نہیں ہے کہ اس کو خاطر میں لاکر وقت کا ضیاع کیا جائے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ قائداعظم کا نظریہ پاکستان قرآنی نظریہ قومیت ہی پر مبنی تھا اور یہی ہمارے خطاب کا موضوع ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ قرآنی نظریہ قومیت کی غیر مبہم انداز میں واضح دوٹوک الفاظ میں وضاحت کی جائے۔ عزیزانِ گرامی قدر!

قرآن کے نظامِ حکومت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام نوع انسان کو ایک قوم (عالمگیر برادری) قرار دیتا ہے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213)- اس لئے وہ رنگ' نسل' زبان اور وطنیت کی بناء پر انسانوں کو مختلف گروہوں (قوموں) میں تقسیم کرنے کے خلاف ہے۔ وطنیت کی بناء پر تقسیم کو علامہ اقبال نے بھی اپنے مخصوص انداز میں اس کی یوں سرزنش کی ہے کہ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

قرآن نے تو نسل اور قبیلہ کے نام سے پکارے جانے کا مقصد سورۃ الحجرات میں چار الفاظ میں بیان کر دیا کہ: وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (49:13) خاندان یا قبیلے (جن کی بنیاد پر قوم کی تشکیل ہوتی ہے) سے مقصود صرف اس قدر ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں آسانی ہو۔

قرآن ساری دنیا کو ایک ملک اور تمام انسانوں کو ایک وحدت بتاتا ہے اور ان میں تفریق کا صرف ایک ہی معیار قرار دیتا ہے یعنی نظریاتی فرق۔ بالفاظِ دیگر دنیا کے تمام وہ انسان جو وحی کی رو سے متعین کردہ مستقل اقدار کو زندگی کا نصب العین قرار دیں' اس کے نزدیک ایک قوم کے افراد ہیں (خواہ دنیا کے کسی حصے کے رہنے والے اور کسی نسل سے متعلق ہوں) اور وہ لوگ جو اس نصب العین کے خلاف کوئی اور نصب العین قرار دیں' اس کے نزدیک وہ دوسری قوم کے افراد۔ اس کو قرآن کی اصطلاح میں کفر اور مومن کی تقسیم کہا جاتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (64:2)- اس (خدا) نے تمہیں انسانی پیکر عطا کیا۔ تم میں سے بعض کافر اور بعض مومن ہو جاتے ہیں ان دو گروہوں کے علاوہ اور کوئی معیارِ قومیت قرآن کی رو سے قابلِ قبول نہیں۔

قومیت کے تناظر میں پہلے گروہ کافر کا زندگی کے متعلق مختصر طور پر نظریہ ہے کہ انسان بھی (دیگر حیوانات کی طرح) صرف طبیعی جسم رکھتا ہے۔اس کا جسم طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے اور کچھ وقت کے بعد' انہی قوانین کے مطابق اس کی مشینری رک جاتی ہے۔اسے اس کی موت کہتے ہیں' جس سے فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔اس امر کی وضاحت ہمیں قرآن کریم سے بھی ملتی ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (47:12)- لیکن جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں (اور سمجھتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے) تو ان کی زندگی اور حیوانات کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔وہ انہی کی طرح کھاتے پیتے' سامانِ زیست سے فائدہ اٹھاتے (اور مر جاتے ہیں)۔اس تصور زندگی کا نتیجہ (شرفِ انسانیت کی) تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اس کے بالمقابل دوسرے گروہ مومنین کا نظریہ زندگی یہ ہے کہ انسان صرف طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔اس کے پاس جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جو حیوانات کو نہیں ملی' صرف انسان کو عطا ہوئی ہے۔اسے انسانی ذات یا نفس کہتے ہیں۔انسانی ذات نہ مادی ارتقاء کی پیداوار ہے اور نہ طبیعاتی قوانین کے تابع۔یہ ہر انسانی بچہ کو خدا کی طرف سے پیدائش کے ساتھ عطا ہوتی ہے۔انسانی ذات نشوونما یافتہ شکل میں نہیں ملتی بلکہ مضمر اور امکانی صورت میں ملتی ہے۔

انسانی ذات کی ماہیت کیا ہے یہ نہ بتایا جاسکتا ہے اور نہ سمجھا جاسکتا ہے۔اس لئے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں۔انسانی ذات کو خدا نے ''جدید یا منفرد تخلیق'' سے تعبیر کیا ہے۔اس لئے یہ نہ تو طبیعی ارتقاء کی پیداوار ہے اور نہ ہی طبیعی قوانین کے تابع جن کے مطابق انسانی مشینری زندہ اور مصروفِ عمل رہتی ہے۔انسانی ذات کا مظاہرہ اس کے اختیار و ارادہ سے ہوتا ہے۔اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک غیر مادی ''شے'' ہے جو اختیار و ارادہ کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس اختیار و ارادہ کی آزادی میں انتخاب کرنے میں اسے عقل اور علم کی دونوں صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔

جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے قوانین مقرر ہیں' اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی خدا کی طرف سے قوانین دیئے گئے ہیں۔انسانی جسم کی پرورش اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ شخص خود کھائے یا استعمال کرے۔اس کے برعکس' انسانی ذات کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ شخص دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دے۔بالفاظِ دیگر' جسم کی پرورش' لینے سے ہوتی ہے ذات کی پرورش ''دینے'' سے الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (92:18)- وہ شخص جو ہر اس چیز کو (مالی یا علمی نوعیت وغیرہ کی) جو اس کے پاس ہے وہ دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے تاکہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے اور جس کی ذات کی نشوونما ہو جاتی ہے وہی مقصدِ حیات میں کامیاب ہوتا ہے۔قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى- (87:14) لہٰذا انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ انسان اجتماعی زندگی بسر کرے۔اس کے بغیر اس کی ذات کی نشوونما نہیں ہوسکتی۔انسان کو سیاست میں ''تمدنی جانور'' اسی لئے کہا جاتا ہے کہ معاشرہ کے اندر رہنا اس کی جبلت میں شامل

ہے۔ ذات کی نشوونما کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جس میں ہر شخص کی جسمانی ضروریات بھی بآسانی پوری ہوتی رہیں اوراس کے ساتھ اسے اس کی ذات کی نشوونما کے پورے پورے مواقع اوراسباب وذرائع بھی میسر ہوں۔ ایسے معاشرہ کوقرآن جنتی معاشرہ سے تعبیر کرتا ہے جواس کے قانون کے مطابق متشکل ہوا ہو۔اس میں ہمارا دوسرا گروہ جماعتِ مومنین کا شامل ہوتا ہے جوقرآنی نظریہ قومیت پر ایمان رکھتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ: فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾ (89:29-30)۔تم (جماعتِ مومنین) کی جماعت میں شامل ہوجاؤاوراس طرح جنتی معاشرہ میں داخل ہوجاؤ۔

یہ بھی یادرہے کہ نشوونما یافتہ ذات' انسانی جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہوتی' بلکہ بدستور زندہ رہتی اور مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے۔ ایک چیز ہے حیات بعد الممات (Survival after death) اور دوسری چیز حیاتِ جاوداں (Immortality)۔ حیات بعد الممات تو ہر ذی شعور انسان کے لئے ہے لیکن حیاتِ جاوداں صرف اس ذات کے حصے میں آسکتی ہے جس کی باقاعدہ نشوونما ہوچکی ہو۔ حیاتِ جاوداں ملنے سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی زندگی کی طبیعی موت کے بعد اسے پھر موت نہیں آئے گی۔ قرآن کریم کے الفاظ میں: لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى (44:56)- یہ لوگ اس میں' اس پہلی موت کے علاوہ (جس کا مزہ وہ پہلے چکھ چکے ہیں) موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔''

لہٰذا وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کریں گے۔

عزیزانِ گرامی قدر! امید ہے دونوں سیکولر اور قرآنی نظریہ قومیت آپ کی نظروں میں آ گیا ہوگا اور آپ قرآنی نظریہ کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف ہو گئے ہوں گے۔

ان دونوں سیکولر اور قرآنی نظریہ قومیت کی وضاحت محترم پرویز نے قرآن کی روشنی میں اپنے مخصوص انداز میں اول الذکر کو مذہب اور دوسرے کو دین کے عنوان سے پیش کر کے کی ہے۔ ہم ملاحظہ کر چکے ہیں کہ سیکولر نظام حکومت میں قومیت کا مدارِ اشتراک نسل یا وطن ہے۔ وطن کو ایک خاص خطہ پر محدود کر کے وہاں حکومت انسانوں کے وضع کردہ قوانین سے کی جاتی ہے۔

اس کے برعکس نظریہ پاکستان پیش کرنے والی دونوں مقتدر ہستیوں نے قرآنی نظریہ قومیت (وحی) پر مبنی اپنے نظریہ پاکستان کو ایمان کا اشتراک قرار دیا اور پوری عالمگیر انسانیت کو خطاب کیا ہے۔ مذہب اور دین کے تقابل میں سمجھنے کی یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ سیکولر (عصری) نقطہ نگاہ سے دین کو مذہب ہی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس علامہ اقبال اور قائداعظم اپنے نظریات میں مذہب کے لئے کوئی جگہ نہیں پاتے۔ وہ دین اور صرف دین ہی کے تناظر میں نظریہ پاکستان پیش کرتے ہیں۔

پاکستان کے دانشور طبقہ میں قائداعظم کے دین کے نظریہ (جس کی آگے وضاحت کی جارہی ہے اسے جہالت اور لاعلمی کی بنا پر ان پر سیکولر نظام کے نفاذ کرنے کو منسوب کیا جارہا ہے۔ قائداعظم کے نظریہ دین کی وضاحت بہت ہی کم پلیٹ فارم سے سنائی دیتی ہے‘ اس لئے کچھ دانشور طبقوں کی نظر میں دین‘ مذہب ہی کی شکل میں ہوتا ہے۔ مذہب کی مخالفت تو خود قائداعظم کی طرف سے بھی ہوتی ہے‘ اور یہ نام نہاد دانشور طبقہ مذہب اور دین کے فرق سے لاعلم ہونے کی بنا پر قائداعظم پر سیکولر ہونے کا الزام لگا دیتے ہیں۔

لہٰذا ان دونوں نظریات کا تقابل پیش کیا جاتا ہے۔

مذہب اور دین کا تقابلی جائزہ

مذہب (سیکولر نظریہ)	دین (قرآنی نظریہ قومیت)
1-مذہب‘ خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظام زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
2-مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہوجاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بنا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
3-مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
4-مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
5-مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔	دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوعِ انسانی سے مخاطب اور اس کا رب‘ رب العالمین اور رسول رحمۃ العالمین کا مقام رکھتے ہیں۔
6-مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔ زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ بساز	دین‘ انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کا پیغام کی تعلیم یوں دیتا ہے۔ زمانہ باتونسازد تو با زمانہ ستیز
7-مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔	دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

8-مذہب کشمکش حیات سے فرار سکھاتا ہے۔

دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

9-مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے۔

دین' اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے' حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

10-مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

دین' اسے وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔

11-مذہب' کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھاتا ہے۔

دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے' جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے(القرآن)۔

12-مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔

دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔

13-مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلا علم و دلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔

دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک پر بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل و تدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔

14-مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)' سرمایہ دارانہ (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔

دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جا سکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوع انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوع انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دین کی اطاعت کرتا ہے۔

عزیزانِ گرامی قدر! محترم پرویز صاحب کے دیئے ہوئے مذہب اور دین کے تقابل سے امید ہے کہ دونوں نظریات کا فرق واضح ہو گیا ہوگا۔ لہٰذا اب وقت آ گیا ہے کہ بات کو آگے بڑھایا جائے۔ ہمیں یہ بات ملحوظِ نظر رکھنی چاہئے کہ قرآنی نظریہ قومیت پر ایمان رکھنے والوں کے لئے انسانی ذات کی نشوونما کے لئے صرف معاشرہ کی موجودگی ہی کافی نہیں بلکہ ایسے معاشرہ کی موجودگی ضروری خیال کی جاتی ہے جہاں قرآنی اقدار کا عملاً نفاذ بھی ہو جس میں قرآنی معاشرہ کی تمام خصوصیات شامل ہوں۔

قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا۔۔۔؟

1- قرآنی معاشرہ میں ہر شخص کی عزت بلاتمیز قوم، رنگ، نسل، پیشہ، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ہوگی۔ کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا۔ برتری کا معیار یہ ہوگا کہ کوئی شخص اپنے فرائض کی بجا آوری میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے اور نوعِ انسان کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کرتا ہے۔

2- کوئی شخص بے کس ولاچار اور بے یار و مددگار نہیں ہوگا۔ ہر ایک کی بات سنی جائے گی، اور تکلیف رفع کی جائے گی۔ ہر شخص کو انصاف ملے گا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملے گا۔ کوئی صاحب اثر انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکے گا۔

3- کوئی فرد بھوکا ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہو گا۔ یعنی قرآنی معاشرہ ہر شخص کی اور اس کی اولاد کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا۔

4- معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا انتظام کرے جس سے انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔ بالفاظِ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔

5- ہر شخص اپنی پوری استعداد و محنت سے کام کرے گا۔ صرف وہ افراد کام نہیں کریں گے، جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو گئے ہوں، یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہو جائیں اور باقی لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

6- ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔ باقی اپنے دل کی رضامندی سے حاجت مندوں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھے گا۔ ذات کی نشوونما کا یہی طریق ہے۔

7- رزق کے سرچشمے (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہیں گے تاکہ وہ افرادِ معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ جب افراد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی اور رزق کے سرچشمے حاجت مندوں کے لئے کھلے رہیں گے تو کسی کے لئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جائیدادیں بنانے کا سوال ہی

پیدا نہیں ہوگا۔

8- ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہوگا نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی مرضی کے مطابق (اس معاشرہ میں گروہوں' لیڈروں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوگا۔) اس لئے اس میں نہ کسی قسم کا جور ہوگا نہ استبداد نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی۔ اسے نظامِ خداوندی یا قرآنی نظامِ معاشرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

9- ہر شخص کھل کر بات کرے گا۔ اس کے دل میں نہ کسی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد و بھروسہ ہوگا اور فریب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہوگا۔

10- یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوگا کہ ہر شخص قوانینِ خداوندی کے محکم اور مکافاتِ عمل کے برحق ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ نظام قائم ہی ان بنیادوں پر ہوگا۔ اس میں قرآن کریم کی مستقل اقدار عملاً نافذ ہوں گی۔

ہوسکتا ہے کہ کچھ احباب کے دل میں یہ خیال آرہا ہو کہ ایسے قرآنی معاشرہ کے قیام کا خیال ایک خیالی معاشرہ (Utopia) ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ خیالی معاشرہ نہیں بلکہ درج ذیل طریق سے ہر دور میں قابلِ العمل ہے۔

قرآنی نظام کے نفاذ کے لئے طریقِ کار

جو جماعت کسی مستقل قدر یا غیر متبدل اصول کی پابند نہیں ہوتی' وہ اپنے نظام کو نافذ کرنے کے لئے جو طریق بھی چاہے' اختیار کرسکتی ہے۔ ان کے نزدیک طریق کار کے جائز یا ناجائز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو طریق بھی حصولِ مقصد کے لئے مدد و معاون ہو' وہ ان کے ہاں جائز قرار پاتا ہے۔

ان کے برعکس جو جماعت مستقل اقدارِ حیات اور غیر متبدل اصولوں پر ایمان رکھے' اس کے نزدیک ذرائع اور مقصد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد حق پر مبنی ہوتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے ذرائع بھی وہی اختیار و استعمال کرسکتی ہے جو مبنی برحق ہو۔ وہ اس حقیقت پر یقین رکھتی ہے کہ غلط راستہ کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا' لہٰذا' جو جماعت قرآن کا نظام نافذ کرنا چاہے وہ کبھی کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرسکتی جو قرآن کی رو سے باطل ہو۔ لوٹ مار' قتل و غارت گری' خلفشار' انتشار وغیرہ قرآن کے نزدیک سخت مذموم اور جھوٹ' فریب' مکاری' عیاری بدترین جرائم ہیں۔ وہ اس طریق کار کو فساد قرار دیتا ہے اور مفسدین اس کے نزدیک بدترین خلائق ہیں۔ اس کا طریق انقلاب ہے فساد نہیں اور ان دونوں میں جو بنیادی فرق ہے اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ آج کل بدقسمتی سے فساد ہی کو انقلاب کہہ کر پکارا جارہا ہے۔

قرآن کریم کے نزدیک خارجی دنیا (یا نظام) میں کوئی صحیح تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اس تبدیلی کی متمنی جماعت کے افراد کے قلب و نگاہ میں' قرآنی اقدار کے مطابق تبدیلی پیدا نہ ہو۔ وہ قلب و نگاہ کی اس داخلی تبدیلی کو

انقلاب قرار دیتا ہے۔قلب ونگاہ میں اس قسم کی تبدیلی کا کام' ایک دن کی بات نہیں۔ یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور ہمت طلب بھی ہوتا ہے اور کافی وقت کا متقاضی بھی۔ اس مرحلہ میں صبر طلبی ہی دشواری نہیں ہوتی بلکہ قلب ونگاہ میں تبدیلی پیدا کرنے کا یہ مرحلہ بڑا غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ اس میں بظاہر نہ کوئی حرکت نظر آتی ہے نہ حرارت۔ اس لئے سطح بین نگاہیں اسے ''بے عملی'' سے تعبیر کر دیتی ہیں اور ان کے اس طعن سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود اس جماعت کے زیر تربیت افراد' اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ دنیا بہت آگے نکلے جارہی ہے اور ہم یونہی اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ لیکن قرآنی جماعت نہ اغیار کے اس قسم کے طعنوں سے متاثر ہوتی ہے نہ خود اپنے اندر کے افراد سے مصالحت کی خاطر اپنا راستہ بدلنے کے لئے تیار۔

خود نبی اکرم ﷺ اور جماعتِ مومنین کی مکی زندگی کے تیرہ سالہ طول طویل (اور بظاہر بے حس وحرکت) مدت اس صبر طلبیٔ عشق کی مظہر تھی۔ جب اس جماعت کے افراد میں قلب ونگاہ کی ایسی تبدیلی اور سیرت وکردار میں ایسی پختگی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس نظام کے قیام کے لئے عملی قدم اٹھاتی ہے اور اس میں کوئی حربہ ایسا استعمال نہیں کرتی جسے قرآن فساد قرار دیتا ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس منزل کے حصول کے بعد قرآنی معاشرہ کا قیام درج ذیل اقدامات سے ممکن العمل ہوسکتا ہے۔

1- ایک آزاد مملکت اس امر کا اعلان کرے کہ اس کا تمام کاروبار' قرآنِ کریم کے مطابق ہوگا۔

2- قرآنِ کریم میں کچھ احکام وقوانین' متعین شکل میں دیئے گئے ہیں اور بعض اقدار' اصول کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔قرآن کے احکام وقوانین ہوں یا اصول واقدار' سب غیر متبدل ہیں اور تمام مسلمانوں پر ہمیشہ کے نافذ العمل رہنے کے لئے دی گئی ہیں۔

3- جن اقدار کے صرف اصول دیئے گئے ہیں' مملکت کے اربابِ فکر ونظر' نمائندگانِ ملت' ان اصولوں کی روشنی میں' اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق' ان سے جزئی قوانین مرتب کریں گے۔ ایسا کرنے میں وہ احادیث' تاریخ' فقہ کو اپنے سامنے رکھیں گے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق' قوانین مرتب کریں گے۔ جو کچھ پیچھے سے چلا آرہا ہے' اس میں سے جو قوانین ایسے ہوں گے جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہیں اور جو ہمارے زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں' انہیں ایسے ہی رہنے دیا جائے گا۔جن میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی' ان میں تبدیلی کرلی جائے گی۔ جہاں نئے قانون کی ضرورت ہو' نیا قانون بنالیا جائے گا۔اس طرح قرآن کے اصول غیر متبدل رہیں گے اور ان کے اندر وضع کردہ قوانین' زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ' بدلتے جائیں گے۔ یوں مستقل اور قابل تغیر وتبدل عناصر کے حسین امتزاج سے' کاروانِ ملت آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

خواجہ ازہر عباس، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مغربی جمہوریت
موجودہ پاکستان اور قرآن

انسانوں نے جب مل جل کر رہنا شروع کیا تو قبیلوں کی شکل از خود بنتی چلی گئی اور آہستہ آہستہ بتدریج، ملوکیت نے جڑ پکڑنا شروع کی۔ حالات کے مطابق معاشرہ کے نظم وضبط کی صورت خود پیدا ہوتی چلی گئی۔ خود انسانی فکر نے کوئی ضابطۂ حیات تشکیل نہیں دیا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ مختلف اشکال بدلنے کے بعد جمہوریت سامنے آئی ہے اور آج کل ہر جگہ جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ اس لئے سابقہ ادوار کے نظاموں پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ تو از خود ختم ہو گئے ہیں۔ البتہ نظامِ جمہوریت پر تبصرہ کرنا ضروری ہے کیونکہ ہمیں اسلامی نظام کی فوقیت و برتری ان تمام نظاموں پر دکھانی ہے جو انسانی فکر نے وضع کئے ہیں۔

پہلی بات تو غور کرنے کی یہ ہے کہ جمہوریت کوئی نظام نہیں ہے نہ تو یہ انسانی زندگی کے مقاصد متعین کرتی ہے اور نہ ہی اس کی کوئی اساس و بنیاد ہے۔ ہندوستان میں تقریباً 70 سال سے جمہوریت جاری ہے۔ لیکن جمہوریت کے جاری ہونے سے ان کے عقائد ورسومات میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ نہ ہی اس نے مقاصدِ زندگی قوم کو دیئے۔ ایک آدمی ایک ووٹ کی بناء پر مساوات انسانی کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں ذات پات اور جاتی سسٹم میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ وہاں برہمن کو وہی مقام حاصل ہے جو ان کے معاشرہ میں مقرر کیا ہوا ہے اور جو پہلے تھا۔ دلیت Dalits، آج بھی وہاں جانوروں کی طرح سمجھے جاتے ہیں۔ جمہوریت صرف حکومت بنانے کی مشینری تک کام آتی ہے۔ اس کے علاوہ معاشرہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ البتہ لوٹ مار کرنے میں بھی یہ منتخب حضرات ایک دوسرے کی پشت پناہ بنے ہوئے ہیں۔

جمہوریت میں کوئی مستقل اقدار نہیں ہوتیں۔ حق و باطل کا فیصلہ اکثریت واقلیت کے اصول پر کیا جاتا ہے آج ایک پارٹی کو ایک قانون بنانے کے لئے 52 فیصد ووٹ مل گئے۔ تو وہ قانون جائز ٹھہر گیا۔ کل ہی 4 ممبران اسمبلی چھوڑ کر مخالف پارٹی میں چلے گئے اور انہوں نے اپنا ووٹ اس نئی پارٹی کو دے کر اس قانون کو ناجائز قرار دے دیا، 4 ارکان کی اکثریت واقلیت کی بناء پر حق باطل اور باطل حق بن جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اکثریت کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ حضور ﷺ کو حکم ہوا وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ ؕ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ (6:116) اور اگر تم زمین پر رہنے والے لوگوں میں سے اکثر لوگوں کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں راہِ خدا سے گمراہ کر دیں گے۔ وہ تو

صرف ظن وگمان کی پیروی کرتے ہیں اور اٹکل پچولڑاتے رہتے ہیں۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ مفکر، مدبر اور محقق اور بااصول اور باضمیر لوگ نہایت قلت میں رہے ہیں اکثریت ان ہی لوگوں کی ہوتی ہے جو صرف خیالی، بے اصولی اور اٹکل پچو باتوں کے پیچھے چلنا شروع کر دیتے ہیں اگر تم اسی اکثریت کا کہنا ماننے لگو گے، اور بے اصولی باتوں پر چلنا شروع کر دگے تو خدا کی بتلائی ہوئی سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے۔

آج کی دنیا پر نگاہ ڈالیئے اور ان حکومتوں پر جو اکثریت کی بنیاد پر قائم ہوئی ہیں اور ان قوانین پر جو اُن کی اکثریتوں نے وضع کئے ہیں ان کو دیکھنے سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اکثریت نے کبھی اقلیت کے ساتھ نیک سلوک نہیں کیا۔ استعمار، جنگیں، خونریزیاں، شراب نوشی، قماربازی، اسقاطِ حمل، لواطت، فحشاء ومنکر دوسروں کا استحصال، Exploitatin، یہاں تک کہ بعض وہ گھناونے اور باعث شرم وحیا کام، جن کے ذکر سے حیا آتی ہے۔ ایسے ترقی یافتہ ممالک میں رائج ہیں جن کو عوام کے نمائندوں کی حمایت حاصل ہوتی ہے اور جو عوام کی اکثریت کی عکاسی کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے فرمایا: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) اللہ تعالیٰ کے علاوہ حقِ حکومت کسی کو بھی نہیں ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں ان حصر یہ ہے یعنی صرف اور محض کے معنی میں آتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی کو حقِ حکومت ہو ہی نہیں سکتا۔ سورۂ مائدہ میں ارشادِ عالی ہے وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ (5:44) جو قوانین خداوندی کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ کافر ہیں۔ اقتدار کا سرچشمہ صرف ذاتِ خداوندی ہے اس کے برخلاف مغربی جمہوریت میں اقتدار وقوت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں اس طرح جمہوریت اصل کے اعتبار سے بالکل شرک اور قرآن کے خلاف ہے ارشادِ عالی ہے وَلَا يُشۡرِكُ فِىۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا (18:26) اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اس کے حکم میں کسی کو شریک کرنا شرک ہے۔ اس کے حکم میں کسی کو شریک کرنا، اور عوام کی طرف حقِ حکومت کو منتقل کرنا شرک ہے۔ بنیادی طور پر شرک ہے۔ قرآنِ کریم فرماتا ہے کہ یہ اقتدارِ مطلق جس کو Sovereignty کہا جاتا ہے یعنی جس کے فیصلہ کے بعد کسی اور کا فیصلہ جاری نہیں ہوسکتا آخر ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے لَا يُسۡـئَلُ عَمَّا يَفۡعَلُ وَهُمۡ يُسۡـئَلُوۡنَ (21:23) اس کی پوچھ گچھ نہیں ہوسکتی ہاں ہر شخص کی بازپرس ہوگی۔ جمہوریت میں قولِ آخر وقولِ فیصل عوام کا ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے یہ نظریہ ہی غلط ہے انسان انسان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں اور کسی برابر والے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں پر حکومت کرے۔ یہ غلامی ہے اور یہ مقام انسانیت کے خلاف ہے۔ قرآنِ کریم نے ساری انسانیت کو عزت وتکریم دی ہے (17:70) انسانیت کے ایک حصہ کو حاکم بنانا اور دوسرے حصہ کو اس کا محکوم بنانا قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے قرآن کریم پوری ملت کو اقتدار دیتا ہے اس میں حاکم محکوم کی تفریق نہیں ہوتی (24:55) علامہ اقبال نے فرمایا کہ انسان خوئے غلامی میں کتوں سے بھی بدتر ہے کیونکہ میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی کُتا کسی کتے کی غلامی کرتا ہو۔

یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است   من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

جمہوریت کا دوسرا اصول جو قرآن کے خلاف ہے اور جو اس کا جز ولاینفک ہے وہ اس کا پارٹی سسٹم ہے۔ قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک فرقہ بندی شرک ہے (30:32) ارشادِ عالی ہے:

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٣١﴾ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿٣٢﴾ (30:31-32)

ترجمہ: اور مشرکوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود ایک فرقہ بن گئے اور سب فرقے اسی میں خوش ہیں جو اُن کے پاس ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ (6:160)

ترجمہ: جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے بنا لئے ان سے تم کو (یعنی رسول اللہ ﷺ کو کوئی واسطہ نہیں)۔

اس آیت سے واضح ہے کہ پارٹی سازی کرنے والوں کا کوئی تعلق رسول اللہ ﷺ سے نہیں رہتا۔ پھر ارشادِ عالی ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ (3:103)

ترجمہ: اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور پارٹیاں نہ بنانا۔

اس آیت میں الفاظ واضح اور بہت موثر ہیں۔ آیت کا پہلا حصہ موجبہ ہے اور دوسرا حصہ سالبہ ہے۔ یعنی پہلے حصہ میں یہ امر ہے کہ قرآن کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور دوسرے حصہ میں یہی ہے کہ پارٹی نہ بننے دینا اس طرح آیت کے مفہوم کو بہت اچھی طرح بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور پارٹی نہ بنانا۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پارٹی بنتی ہی اس وقت ہے جب اللہ کی رسی کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جب تک اللہ کی رسی ہاتھ میں رہے گی فرقہ یا پارٹی نہیں بن سکتی۔ فرقہ صرف اور صرف اس وقت بنتا ہے کہ جب اللہ کی رسی کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس آیت سے یہ بات نکھر کے سامنے آ گئی کہ فرقہ بندی یا پارٹی سازی کی اصل وجہ اور بنیادی سبب قرآن کو چھوڑنا ہے اور فرقہ بندی اور پارٹی سازی کا کوئی تعلق قرآن سے نہیں رہتا۔ ان تین آیات سے (3:103،6:160،30:32) یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں اور پارٹی بنانے والوں کا کوئی تعلق نہ قرآن سے رہتا ہے نہ اللہ اور رسول ﷺ چونکہ قرآن کریم کی رو سے دین اور سیاست میں کوئی تفریق نہیں ہوتی اور دین اور سیاست ایک ہی چیز ہوتی ہے اس لئے جمہوریت پر اور ان تمام جمہوری پارٹیوں پر ان آیات کریمات کا اطلاق اسی طرح ہوتا ہے جس طرح دین اور دینی اداروں پر۔ جمہوریت کا ایک بڑا عیب یہ ہے کہ اس نظام میں کوئی غریب آدمی براہِ راست کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا۔ نظامِ جمہوریت میں براہِ راست کوئی کردار وہ شخص ہی ادا کر سکتا ہے جو الیکشن میں حصہ لے اور اس کے ذریعے منتخب ہو کر کسی اسمبلی کا ممبر بن جائے اور یہ بات کسی بھی غریب آدمی کی بساط سے باہر ہے۔ انگلینڈ میں جمہوریت کسی نہ کسی شکل میں تقریباً ہزار سال سے

رائج ہے کبھی بھی ان کی پارلیمنٹ میں کوئی غریب کسان، مزدور، دھوبی، مالی، بس ڈرائیور، چھوٹا دوکاندار، چھوٹا کارخانہ دار منتخب ہوکر نہیں آیا۔ غریب تو صرف ووٹ ہی دے سکتے ہیں اور سیاستدان کسی طرح عوام کو اپنے ساتھ لگائے رکھتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس پر تبصرہ کیا ہے جو آگے پیش خدمتِ عالی کیا جائے گا۔ ہماری اسمبلیوں میں بھی ستر سال سے کوئی ایسا قانون شاید ہی پاس ہوا ہو جو غریبوں کی مشکلات دور کرتا ہو۔ گذشتہ سال کلرکوں کی تنخواہوں میں دس فیصد ہی اضافہ ہوا کلرکوں نے احتجاجاً بہت جلوس نکالے لیکن ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی جبکہ اسی دوران اسمبلی کے ممبران نے اپنی تنخواہوں میں معتدبہ اضافہ کیا۔

مغربی جمہوریت کا لازمی نتیجہ سرمایہ داری ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا تعلق کسی فرقہ یا کسی سیاسی پارٹی سے نہیں ہے البتہ جو سیاسی اور مذہبی باتیں قرآن کے خلاف ہوتی ہیں ان پر یہ رسالہ ضرور تبصرہ رقم کرتا ہے۔ جمہوریت کا لازمی نتیجہ سرمایہ داری ہوتا ہے اور اسی کا ایک شاخسانہ پانامہ لیکز ہیں۔ اس سے ملک کے کافی سرمایہ دار متاثر ہوئے ہیں۔ زیر بحث یہ بات ہے کہ اربوں پاؤنڈ کی رقوم پاکستان سے باہر جائز طور پر گئی ہیں یا ناجائز طور پر گئی ہیں۔ اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کرتا کہ پاکستان ایک ایسا غریب ملک ہے کہ اس کی ایک بڑی آبادی کو روزانہ کی روٹی بھی مشکل سے میسر آتی ہے۔ اس غریب ملک کے لیڈروں کو یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ وہ اربوں پاؤنڈز کے فلیٹ خرید کر ان میں رہائش پذیر ہوں۔ لیکن یہاں بحث یہ ہے کہ وہ رقوم قوانین کے مطابق گئیں یا خلافِ قانون گئیں، اور لطف کی بات یہ ہے کہ قانون سازی خود ان کا اختیار ہے۔ اگر وہ رقوم خلاف قانون گئی ہیں تو یہ خود اس کو قانون کے دائرے میں لے آئیں گے، اور اس بات کو قانون کے دائرے میں لانا کیا مشکل ہے۔ جمہوریت کے علی الرغم قرآن کے نظام میں تو یہ حکم ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219)

ترجمہ: تجھ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں اور جو ضرورت سے زیادہ ہے وہ سب دے دے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ (53:39)

ترجمہ: انسان کے لیے جائز صرف وہ ہے جو اس نے خود اپنی محنت سے کمایا۔

اور یہ دونوں حکم وہ ہیں جنہیں کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔ قرآن کریم تو دولت جمع کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ سارے قرآن میں ایک آیت ایسی نہیں ہے جس نے دولت جمع کرنے کی اجازت دی ہو۔

گفتگو سیاسی لیڈروں اور عوام کے درمیان جہنم میں ہوگی، قرآن کریم نے ان پر تبصرہ بھی کیا ہے، اور ان کے ہتھکنڈوں کا ذکر بھی کیا ہے جس سے یہ لوگ عوام کو اپنے پیچھے لگائے رکھتے تھے۔ قرآن چونکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہ قانون سازی کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی حکومت کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ لہٰذا وہ ان سیاسی لیڈروں کو اللہ کا مدمقابل ٹھہراتا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا
يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ (6:123)

ترجمہ: اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اکابر مجرم بنائے تا کہ ان میں مکاری کیا کریں اور وہ لوگ جو کچھ بھی مکاری کرتے ہیں اپنے ہی حق میں برا کرتے ہیں اور سمجھتے تک نہیں۔

قرآن کریم کے مطابق سیکولر (جمہوری) نظام میں زندگی بسر کرنے والا ہر فرد مجرم ہوتا ہے اور ان کے سیاسی لیڈروں کو ''اکبر مجرمین، مجرموں کا سردار کہا ہے۔ جب حضرت صالح قوم ثمود کی طرف مبعوث ہوئے اور انہوں نے اس قوم کی اصلاح کی کوشش کی، قوم کی جو بھی حالت تھی لیکن قرآن نے یہ نشاندہی کی ہے کہ قوم کو تباہ وغارت کرنے والے صرف نو لیڈر رہیں جو قوم میں فساد پھیلا رہے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ (27:48)

ترجمہ: اور شہر میں نو لیڈر تھے جو ملک میں فساد کر رہے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

قرآن کریم کے مطابق تو قوموں کے بگاڑ اور اصلاح کے بارے میں سیاسی لیڈروں کی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہی لیڈر وہ ہیں جو قوم کو اس منڈی میں اتارتے ہیں جہاں اس جنس کا سدکا کوئی خریدار نہیں ہوتا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ
وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ (14:28-29)

ترجمہ: ان سیاسی لیڈروں کی حالت کو دیکھو جنہیں اللہ نے بہت ساری خوشگواریاں عنایت کی تھیں۔ لیکن ان سیاسی لیڈروں نے ان خوشگواریوں کی قدر نہیں کی اور اپنی قوم کو ایسی منڈی میں اتار دیا جس میں ہر طرف کساد بازاری تھی۔ جہاں اس جنس کا سدکا کوئی خریدار نہیں تھا۔ یعنی اُنہیں تباہی کے جہنم میں ڈال دیا اور یہ کیسی بُری جگہ ہے جہاں انہوں نے اس قوم کو لا اتارا۔

اگر آپ میں حوصلہ ہے تو آپ خود ہی اندازہ فرمالیں گے کہ اس آیت نے قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک کے دور کی حالت بیان کردی ہے۔

جہنم میں سیاسی لیڈروں اور عوام کے درمیان جو جھگڑے ہوں گے قرآنِ کریم نے ان کو متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو مطعون کریں گے کہ تم نے ہمیں غلط راستہ پر ڈالا ہے۔ یہ جھگڑے بڑے عبرت انگیز اور بصیرت فراوز ہیں۔ ان میں سے چند جھگڑے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

(1) سورۂ احزاب میں ارشاد ہے کہ عوام حضرت باری تعالیٰ کے حضور کہیں گے کہ ہم اپنے جرائم کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ہم ان سیاسی لیڈروں کی اطاعت کیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔ یا اللہ تو ان لیڈروں کو دوگنا عذاب دے۔

وَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا ﴿۶۷﴾ رَبَّنَاۤ اٰتِہِمۡ ضِعۡفَیۡنِ مِنَ الۡعَذَابِ وَالۡعَنۡہُمۡ لَعۡنًا کَبِیۡرًا ﴿۶۸﴾ (33:67-68)

ترجمہ: اور کہیں گے پروردگار ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تو انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ پروردگار ہم پر تو عذاب ہے ہی مگر ان لوگوں پر دوہرا عذاب نازل کرا اور ان پر بڑی بڑی لعنت کردے۔

ان کا یہ عذر قابل توجہ نہیں ہوگا۔ ان عوام سے کس نے کہا تھا کہ تم اپنی عقل وبصیرت استعمال نہ کرو اور دوسروں کے پیچھے چلتے رہو۔

(2) سورۂ سباء میں ہے کہ جب سیاسی لیڈر عوام سے کہیں گے کہ تم خود ہی غلط راستے پر پڑ گئے تھے۔ ہم نے تو تمہیں مجبور نہیں کیا تھا کہ تم غلط راستے پر چلو۔ اس پر عوام جواب دیں گے کہ تم ہر وقت، صبح سے لیکر شام تک اس طرح کے منصوبے بناتے تھے کہ ہم تمہارے دھوکے میں آجاتے تھے۔ اس طرح تم ہمیں اپنے پیچھے لگا لیتے تھے۔

قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡۤا اَنَحۡنُ صَدَدۡنٰکُمۡ عَنِ الۡہُدٰی بَعۡدَ اِذۡ جَآءَکُمۡ بَلۡ کُنۡتُمۡ مُّجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا بَلۡ مَکۡرُ الَّیۡلِ وَالنَّہَارِ اِذۡ تَاۡمُرُوۡنَنَاۤ اَنۡ نَّکۡفُرَ بِاللّٰہِ وَنَجۡعَلَ لَہٗۤ اَنۡدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَۃَ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ ؕ

(34:32-33)

ترجمہ: سرکش لوگ کمزوروں سے کہیں گے کہ جب تمہارے پاس خدا کی طرف سے ہدایت آئی تھی تو کیا اس کے آنے کے بعد ہم نے تمہیں زبردستی روکا تھا (ہرگز نہیں) بلکہ تم خود مجرم تھے اور کمزور لوگ بڑے لوگوں سے کہیں گے کہ زبردستی تو نہیں کی مگر ہم خود بھی گمراہ نہیں ہوئے۔ بلکہ تمہاری رات دن کی فریب دہی نے گمراہ کیا کہ تم لوگ ہم کو خدا کے نہ ماننے اور اس کا شریک ٹھہرانے کا برابر حکم دیتے تھے تو ہم کیا کرتے اور جب یہ لوگ عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل ہی دل میں پچھتاویں گے۔

(4) سورہ ص میں ہے کہ ہم مسلک لوگوں کا ایک گروہ جہنم میں داخل ہوگا تو ان میں بھی یہی باہمی تکرار ہوگی کہ اس عذاب کا ذمہ دار کون ہے۔ اس کے ساتھ وہ بھی کہیں گے کہ وہ لوگ کہاں چلے گئے جو ہمیں دنیا میں غلط کاموں سے روکا کرتے تھے اور ہم کہا کرتے تھے کہ وہ بدترین خلائق ہیں وہ جنت میں ہوں گے (38:59)، یہ بات بیان کرنے کے بعد قرآن کریم کہتا ہے کہ:

اِنَّ ذٰلِکَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَہۡلِ النَّارِ ﴿۶۴﴾ (38:64)

ترجمہ: جہنم والوں میں باہمی جھگڑے یقینی بات ہے۔

(5) سورۂ مومن میں عوام اور سیاسی لیڈروں کے جھگڑے کے بعد ہے کہ وہ لوگ جہنم کے داروغہ سے کہیں گے کہ تم ہی

کچھ کرو کہ ہم پر یہ عذاب کم ہو جائے۔ لیکن اس داروغہ کو اس کا اختیار ہی نہیں ہو گا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿٤٩﴾
(40:49)

(6) سورہ قٓ میں سیاسی لیڈروں اور عوام کی دشمنی کے بجائے ان لوگوں کی باہمی تکرار کا ذکر ہے جو دنیا میں ایک دوسرے دوست تھے جہنم میں ان میں سے ہر ایک دوسرے کو مطعون کرے گا کہ اس نے بہکا بہکا کر غلط راستوں پر ڈال دیا تھا۔

قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ﴿٢٧﴾ (50:27)

ترجمہ: اس کا ساتھی کہے گا پروردگار ہم نے اس کو گمراہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ تو خود سخت گمراہی میں مبتلا تھا۔

جب ہم قرآنِ کریم کا مطالعہ کرتے ہیں تو جب اس میں کفار و مشرکین، منافقین اور دوسری طرف مومنین و متقین کا تذکرہ آتا ہے تو ہم اپنے خیال میں یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نزولِ قرآن کے دور کے لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ جب منافقین کا ذکر آتا ہے تو ہمارا ذہن حضور ﷺ کے دور کے منافقین کی طرف جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی اُن آیات کا اطلاق اس دور میں بھی بالکل اسی طرح ہو رہا ہے جس طرح حضور ﷺ کے دور پر ان کا اطلاق ہوتا تھا۔ یہ آیات ہمیں بھی Cover کرتی ہیں ان مشرکوں اور منافقوں میں ہمارا ہی ذکر ہو رہا ہے۔ مومنین و متقین میں بھی ہمارا ذکر ہو رہا ہے۔ قرآنِ کریم نے عوام اور سیاسی لیڈروں کا ان آیات میں ذکر کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے اس دور کے پاکستانی عوام اور لیڈروں پر انگلی رکھ دی ہے۔ ان آیات میں یہ سارا ہمارا ہی ذکر ہو رہا ہے۔ آپ ان آیات میں سے ہر آیت کو الگ کر کے، اس پر غور کریں اور اس کو اس وقت کے لیڈروں پر منطبق کر لیں۔ یہ رسالہ چونکہ عملی سیاست اور سیاسی لیڈروں کے احوال بیان کرنے سے اجتناب کرتا ہے ورنہ ہم خود ان آیات کو اس دور کے عوام اور لیڈروں پر منطبق کر کے آپ کو دکھلا دیتے اور آپ کو خود یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تکملہ نظامِ جمہوریت:

ہم اپنا یہ مضمون ختم کر چکے تھے کہ اسی روز ایک بیان عدالت عظمیٰ کا اور چند روز بعد ایک بیان جناب وزیر اعظم صاحب کا سامنے آیا جو اُنہوں نے نارووال میں ایک جلسہِ عام میں دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمارے سیاسی لیڈر روزانہ جھوٹ بولتے ہیں۔ ہر ہفتہ گوشت کا دو روزہ ناغہ ہوتا ہے لیکن یہ سیاستدان ہفتے میں ایک دن بھی جھوٹ بولنے کا ناغہ نہیں کرتے کہ اس میں جھوٹ نہ بولیں۔ دوسرا بیان جو عدالت عظمیٰ کی طرف سے آیا ہے وہ بڑا اجرأت مندانہ اور حقائق پر مبنی ہے۔ اس میں محترم جج صاحب نے فرمایا کہ سراج الحق صاحب کے علاوہ پوری اسمبلی کے ممبران 62،63 کی زد میں آتے ہیں۔ آرٹیکل 62،63 میں یہ درج ہے کہ ممبرانِ اسمبلی کو صادق و امین ہونا چاہئے۔ محترم جج صاحب کے بیان کا مفاد یہ تھا کہ اس وقت ساری اسمبلی میں سراج الحق صاحب کے علاوہ کوئی ایک ممبر بھی صادق و امین نہیں ہے جج صاحب کا یہ بیان بڑا اجرأت مندانہ ہے اور عدالت

عالیہ کے جج حضرات سے یہ توقع بالکل بجا ہے کہ وہ ایسے ہی بے باک بیان دیا کریں لیکن اس بات سے سخت صدمہ اور افسوس ہوا کہ اگلے ہی روز انہوں نے اپنا بیان Withdraw کرلیا۔ ان محترم جج صاحب کے بیان کو واپس لینے سے آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ ہمارا ماحول کس طرح تاریک اور سچائی سے دور ہے کہ اتنی بڑی شخصیت، جو ہر طرح کا تحفظ رکھتی ہے حق بیان کرنے کے بعد اس کو واپس لینے پر مجبور ہوگئی۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ یہ جمہوریت اور جمہوری سیاست کا لازمی نتیجہ ہے۔ جمہوریت رائج کریں اور اس کے نتائج وعواقب سے بچ جائیں یہ ناممکن بات ہے۔ جمہوریت اپنی ساخت کے اعتبار سے جھوٹ پر مبنی ہوتی ہے۔ جمہوریت میں لوگوں کے درمیان اور مختلف ممالک کے درمیان جو معاہدے تحریر کئے جاتے ہیں وہ ایک خاص زبان میں ہوتے ہیں۔ ہوتے تو ہیں وہ اسی انگلش زبان میں جو ہم رات دن بولتے ہیں اور تحریر کرتے ہیں، لیکن ان کی زبان Diplomatic Language کہلاتی ہے۔ اس Diplomatic Language کے تحریر کرنے والے بھی خاص لوگ ہوتے ہیں جنہیں جھوٹ تحریر کرنے کی مہارت ہوتی ہے۔ یہ زبان اس طرح لکھی جاتی ہے کہ اس میں کوئی واضح بات نہ ہو۔ ہر فقرے کے کئی معانی برآمد ہوتے ہوں جو لوگ اس زبان کے ماہر ہوتے ہیں اُنہیں Appreciate کیا جاتا ہے کہ یہ زیادہ جھوٹ نباہ سکتے ہیں۔ یہ جھوٹ دھوکہ دہی عام ہوتی ہے، اور سب کے سامنے ہوتی ہے، لیکن اس کو سیاست میں بُرا نہیں سمجھا جاتا۔

قرآن کریم صرف اسمبلی ممبران یا عدالتوں کے ججز کے لئے ہی صدق وصداقت کو ضروری قرار نہیں دیتا وہ ہر مسلمان کے لئے صادق ہونا ضروری سمجھتا ہے (3:16)، (33:36) نیز ارشاد ہوا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (9:119)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہنا اور سچوں کے ساتھ ہوجانا۔

جہاں تک امانت کا تعلق ہے قرآن نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (4:58)

ترجمہ: بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مستحق لوگوں کو پہنچادو۔

یہ حضرات جو اسمبلی کے ممبران ہیں یا اربابِ نظم ونسق ہیں عوام ان کو یہ اختیارات دیتے ہیں۔ یہ اختیارات یا اقتدارات ان کے ذاتی نہیں ہوتے۔ جب آپ ووٹ دیتے ہیں تو اپنا اختیار آپ ان کے سپرد کرتے ہیں کہ میری طرف سے تم وہاں یہ بات کرنا۔ اپنے اختیارات اس کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہیں۔ لیکن ہماری اسمبلی میں تو ایک ممبر بھی اس کا اہل نہیں ہے۔

صدق وامانت کی گفتگو کا جمہوری حکومت سے کیا تعلق۔ گفتگو کرنا ہی بے ربط اور بے سود ہے۔ اور اسی حسرت کے ساتھ ہم اپنا تبصرہ یہاں ختم کرتے ہیں۔

❁❁❁❁

جمیل احمد عدیل، بورے والا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گناہ اور جرم میں فرق

اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے کچھ زیادہ ہی پڑھے لکھے۔ ممتاز مذہبی ادارے سے انہوں نے نصف صدی قبل درس نظامی کی سند حاصل کی۔ صف اول کی یونیورسٹی سے انگریزی اور عربی میں ماسٹر کی ڈگریاں حاصل کیں۔ لیکچرر شپ کی لیکن پھر سول سروس میں آ گئے اور اب 75/76 برس کی عمر میں وہ کراچی ایسے مصروف اور پرشور شہر میں خاموشی سے بیٹھے تصنیف و تالیف کے وظیفے میں مشغول ہیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں نہایت پر مغز علمی مقالات تحریر کر چکے ہیں۔ جو معیاری جرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں ایسے فاضل بزرگوں کو سننا چاہئے۔ چند گھنٹوں کی ون ٹو ون ملاقات میں ہم نے بھی انہیں سنا۔ پورے انہماک کے ساتھ۔ جب روانہ ہونے لگے تو جاتے جاتے ایک جملہ انہوں نے ادا کیا۔

''عزیزم! کبھی غور کرنا Sin اور Crime میں کیا فرق ہے؟''

وقت رخصت انہوں نے ایک فکر افروز سوال فضا میں اچھال دیا تھا۔ بہتر ہوتا کہ وہ خود ہی اسکی وضاحت کر کے جاتے پر ہم نے انہیں روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرے بھی نہیں۔

جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی　　　تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

لیکن یہ خوشی ہے کہ ہم ان کا نقطہ نظر اپنی دانست میں درست طور پر سمجھ چکے تھے لہٰذا ایک طرح سے انہوں نے ہم پر احسان کیا کہ ایک زرخیز سوال ہمیں عطا کر دیا تا کہ ہم اس نکتے پر خود غور کریں اور کوئی نتیجہ ترتیب دیں۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ مذکورہ مسئلہ محض نظری بحث نہیں ہے بلکہ عملی زندگی یعنی زمینی حقائق کے ساتھ جڑا ہوا ایک قضیہ ہے۔

آ یئے مل جل کر غور کرتے ہیں کہ گناہ اور جرم میں کیا فرق ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ صدیوں پر مشتمل ہماری سماجی تاریخ دو واضح ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک کا عنوان دین ہے (بلکہ عرف عام میں مذہب کہئے) دوسرے کا سرنامہ دنیا ہے۔ کچھ ضابطے دِین کی دَین ہیں اور کچھ قوانین دنیا کی عطا ہیں۔ جب ہم دینی/ مذہبی دستور سے بوجوہ منحرف ہو جاتے ہیں تو ہمیں احساس گناہ گھیر لیتا ہے اور جب دنیاوی آئین سے کوئی انحراف ہم سے سرزد ہو جاتا ہے تو ہم مجرم قرار پا جاتے ہیں لیکن واضح رہے کہ جرم ثابت ہو جانے کے باوجود ہمیں ''احساس جرم'' ستاتا نہیں ہے۔ اس لئے کہ ''ستانے'' والی چیز کا تعلق داخل سے

ہے۔ خارج سے نہیں۔ اس نکتے کو اور واضح کر دیتے ہیں کہ اگر نماز پڑھتے ہوئے وضو ٹوٹ جائے اور ہم دوبارہ وضو کرنے کی بجائے یونہی اپنی نماز مکمل کرلیں۔ ظاہر ہے اس ضابطہ شکنی کا کوئی گواہ نہیں ہے' لہٰذا ہماری گرفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوصف ایک اضطراب ہمیں لازماً گھیر لے گا اور جب تک ہم اس کا کسی نہ کسی طرح کا ازالہ نہیں کرلیں گے۔ احساس گناہ کا بچھو ہمیں اندر سے متواتر ڈستا ہی رہے گا اس کے برعکس خود ساختہ اور جعلی نمبر پلیٹ والی گاڑی پر پورا شہر گھوم آئیں گے لیکن ہمیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ضمیر کی ہلکی سی چبھن بھی ہمیں بے قرار نہیں کرے گی۔ کیوں؟

اس لئے کہ ہمارا یقین ہے کہ وضو کے سلسلے میں ہم نے خدا کا قانون توڑا ہے جبکہ ''ایک نمبر'' سے مزین پرکشش نمبر پلیٹ لگا کر ہم نے ملکی قانون یعنی اپنے جیسے انسان کے بنائے ہوئے قانون کو پامال کیا ہے۔ ہم نے آج تک نہیں دیکھا کہ کسی گناہگار سے گناہگار فرد نے بھی بھوک پیاس سے عاجز آ کر چھپ کر روزہ توڑ لیا ہو لیکن بڑے بڑے ''پارساؤں'' کے سمگلر ہونے کی شہادتیں ہمارے پاس موجود ہیں۔ کیا ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ ملاوٹ کرنے پر ہمیں احساس گناہ آن گھیرے؟

اچھا یہ بڑی ہی دلچسپ بات ہے کہ ہمارے گناہوں کی فہرست نہایت مختصر اور محدود ہے اور اس فہرست کا اختصاص چند عبادات کے ساتھ وابستہ ہے وگرنہ خدا کے وضع فرمودہ اوامر ونواہی پر جائیں تو اس رنگ میں ایک طویل لسٹ وجود میں آئے گی۔ مگر کیا ہے کہ دو چار گناہوں کو چھوڑ کر باقی سب کے ساتھ ہمارا سلوک وہی ہے جو انسان کے بنائے ہوئے قوانین یا اس کے قرار دیئے ہوئے جرائم کے ساتھ ہے اصل مطالعہ کا موضوع یہ ہے جس کی جانب اکثر ہماری توجہ مبذول نہیں ہوتی یا نہیں ہونے دی جاتی۔

دیکھئے کسی ''جرم'' کے ''گناہ'' بننے میں صدیاں بیت جاتی ہیں یونہی پہلے ہی دن حضرت انسان ٹھنڈے پیٹوں کسی گناہ کو جرم تسلیم نہیں کر لیتا اس سے یہ سچائی منوانا بڑا دشوار ہے۔ سچی بات ہے یہ فریضہ محض سزا کا خوف ادا نہیں کروا سکتا کیونکہ ''دنیوی جرائم'' پر سخت سے سخت سزا بھگت کر بھی مجرم کے ضمیر کو کوئی پریشانی یا ندامت لاحق نہیں ہوتی۔ بغیر ٹکٹ سفر کرنے پر وہ پکڑا گیا ہے تو کیا ہوا؟ جرمانہ ادا کر کے وہ ''نفس مطمئنہ'' لے کر گھر لوٹے گا۔ کسی ٹیکس کی ادائی کے سلسلہ میں اس نے حکام متعلقہ کے ساتھ کوئی ''مک مکا'' کرلیا ہے تو اس میں ''روحانی'' خلش والی کون سی بات ہے؟ لیکن وہی شخص جب حج پر جائے گا تو یہ نہیں ہوسکتا کہ شیطان کو ایک کنکری بھی کم مارنے کا اس سے گناہ کبیرہ سرزد ہو جائے۔ ہر چند کہ ایک ''اعتدال پسند'' گروہ بھی ہے جس کا مسلک ہے: ؎

مَے بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی دو مسجد میں شیخ بھی خوش رہیں' شیطان بھی بیزار نہ ہو

اور ایسے معتدلوں کو ہمارے ایک سابق وزیر اعظم عمرہ یا حج کرانے بھی لے گئے تھے قصہ کوتاہ گناہ کی تعریف یہ ہے جس کے سرزد ہونے پر فرد کا ضمیر اسے اندر سے کوڑے مارے۔ باقی سب جرائم ہیں قطع نظر کہ انہیں کسی انسان نے جرائم قرار دیا ہے یا خالق و مالک نے۔ تاہم یہ سٹڈی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ آخر وہ کون سی قوتیں ہیں جو ایک انسان کے اندرون وبطون سے یہ منوا لیتی ہے کہ مذکورہ فعل ''سادہ جرم'' نہیں ہے بلکہ ''باقاعدہ گناہ'' ہے تو اس سلسلہ میں انہوں نے یہ طے کرلیا ہے کہ کسی

جرم کو گناہ کا ٹائٹل ''مذہب'' ہی دلوا سکتا ہے۔کوئی اور نہیں۔یعنی سزا کا خوف نہیں بلکہ خوف کی سزا سے ہی یہ ذمہ داری ادا ہو سکتی ہے لیکن ادھر پرابلم یہ ہو گئی ہے کہ اس حوالے سے محنت کرنے والوں نے صرف ان جرائم کو گناہوں کا ''اعزاز'' بخشا ہے جن کے ساتھ ان کے مخصوص مفادات وابستہ تھے۔

اس مرحلے میں بعض مقدس اداروں نے لکیریں کھینچیں۔ایک طرف کو دنیا قرار دیا اور اس کے کھاتے میں جملہ جرائم ڈال دیئے اور سادہ خاطروں کو یہ تسلی دلا دی کہ ان کے سلسلے میں اونچ نیچ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔مزید ستم یہ کیا عام لوگوں میں یہ شعور ہی نہیں پیدا ہونے دیا گیا کہ یہ وہ جرائم ہیں جنہیں خدا نے اور اس کے رسول ﷺ نے جرائم قرار دیا ہے۔یہ ظلم ان بڑوں کی ترجیحات نے ڈھایا ہے صرف اس لئے کہ ان کی خلاف ورزی سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔یوں اپنی ساری توانائی کو وہاں مرکوز کیا جہاں ان کے خاص مقاصد کی تکمیل ہوتی تھی۔ہاں ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس مقدس طبقے کو یہ کریڈٹ ضرور جاتا ہے کہ غیر معمولی سعی کر کے اور بڑے ہی باریک نفسیاتی حربے استعمال کر کے ان جرائم (ویسے ان کا جرم ہونا بھی اضافی ہے) کے حوالے سے ''احساس گناہ'' کو ان کے لہو میں شامل کیا ہے۔مثال کے طور پر فلاں مخصوص مقام پر اپنی آمدنی میں سے اتنا حصہ پہنچاتے رہو۔اگر اس میں کوتاہی ہوئی تو دونوں جہانوں میں خائب و خاسر رہو گے۔اچھا محض خالی خولی دھمکی سے کوئی مرعوب نہیں ہوتا اس باب میں یقین دہانی کیسے کرائی گئی؟ یہی ان کا جادو ہے (تفصیلاتِ واردات پھر کبھی سہی)!ہاں جب ماننے والے نے یہ فریضہ ادا کر دیا۔اب اسے بدلے میں کچھ ریلیف بھی تو چاہئے تھا اور ریلیف یہ مہیا کر دیا گیا کہ اب تمہیں ساتوں خیریں ہیں تمہارا پڑوسی بھوک پیاس سے بلکتا رہے دوا دارو کو ترستا رہے تم اس حوالے سے دل پر کوئی بوجھ محسوس نہ کرنا' بلکہ اب تم خوب کھل کھیلو!

صاحبو! یہ بڑا نازک مسئلہ ہے۔ہماری رائے میں ہر وہ جرم گناہ ہے جسے اللہ اور اس کے آخری نبی ﷺ نے جرم قرار دیا ہے۔نیز ان کے بین احکام کی روشنی میں وجود پذیر ہونے والے مرکز ملت نے بھی جسے جرم قرار دیا ہے' وہ حتمی طور پر گناہ ہے ہاں اگر وہ مرکز ملت آج بھی متشکل ہو جائے تو اس کا قرار دیا ہوا جرم عین گناہ ہو گا۔رہا یہ سوال کہ اس کے گناہ ہونے کا انسان کو کیسے یقین آئے گا؟ تو یہاں کسی نوع کی پراسراریت کو فعال کرنے یعنی کسی نفسیاتی exploitation کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔اس باب میں واضح' دوٹوک اور متعین نتائج خود فیصلہ کر رہے ہیں کہ یہ اعمال گناہ ہیں اور اس پس منظر میں دیگر مذاہب اور دین اسلام کا فرق خوب نکھر کر سامنے آ گیا ہے کہ اول الذکر اپنے مخصوص مقاصد کو پرستش کا مرکز بناتے ہیں اور موخر الذکر خالص قوانین خداوندی کے خالص نفاذ (execution) یعنی پوری انسانیت کی فوز و فلاح کے لئے مذکورہ کوشش کرتا ہے۔گویا پہلے والے نفسیات کو capture کر کے مذموم مفادات حاصل کرتے ہیں اور دوسرا انسان کو فیصلے کی آزادی کی نعمت سے سرفراز کر کے حقیقی اقبال کے اعزاز سے معزز کرتا ہے۔

(بشکریہ روزنامہ دن' لاہور 16 جنوری 2007ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

غیر مسلموں کے نیک کاموں کے ثواب کا مسئلہ

سوال: غیر مسلموں کے نیک اعمال کا بدلہ۔

کہا جاتا ہے کہ نجات صرف مسلمان کی ہو سکتی ہے۔ کافر کی نہیں ہو سکتی۔ ایک غیر مسلم بڑے نیک کام کرتا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ چوری نہیں کرتا۔ کسی کو ستاتا نہیں۔ خیرات کرتا ہے۔ غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو کیا اسے اس کے ان نیک کاموں کا کوئی اجر نہیں ملے گا اور اس کی اس لئے نجات نہیں ہوگی کہ وہ مسلمان نہیں ہوا اور ایک مسلمان محض اس لئے جنت میں چلا جائے گا کہ وہ مسلمان تھا خواہ اس کے اعمال کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں۔ اس سوال نے مجھے ایک مدت سے پریشان کر رکھا ہے اور اس کا تسلی بخش جواب کہیں سے نہیں ملتا۔

جواب: اس سوال نے صرف آپ ہی کو پریشان نہیں کر رکھا۔ بہت سوں کو پریشان کر رکھا ہے اور اس کا تسلی بخش جواب اس لئے نہیں ملتا کہ بنیادی طور پر یہ بات صاف نہیں کی جاتی کہ اسلام کہتے کسے ہیں اور کفر ہوتا کیا ہے۔ یہ بنیادی چیز سمجھ میں آ جائے تو اس (بظاہر) پریشان کن سوال کا جواب آسانی سے مل جاتا ہے لہٰذا پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اسلام کے معنی کیا ہیں؟ یہ ہے کیا؟ کفر اور اسلام میں فرق کیا ہے؟ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ کفر اور اسلام میں فرق صرف کھانے پینے کی چیزوں میں جائز اور ناجائز کی تمیز یا پرستش کے طور طریقوں میں اختلاف ہے۔ اصل سب مذاہب کی ایک ہی ہے۔ مولانا آزاد مرحومؒ کے الفاظ میں

> اصل شئے' وہ نظام ہے جسے انسان قائم کرتا اور اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر وہ نظام صحیح ہے تو اس کے اندر اس قسم کی انفرادی نیکیاں انسانیت ساز نتائج مرتب کرتی ہیں اگر وہ نظام ہی باطل کی تخریبی بنیادوں پر استوار ہے تو اس میں افراد کی اس قسم کی نیکیاں اس جرم کا کفارہ نہیں بن سکتیں جو انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے روا رکھا جا رہا ہے

''عالمگیر سچائیاں ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ فرق صرف ظاہری اعمال و رسوم میں ہے اور اس فرق کا نجات و

سعادت سے کچھ تعلق نہیں''۔ یہ ہے اسلام کے متعلق وہ بنیادی غلط فہمی جس کی وجہ سے وہ تمام سوالات سینے میں ابھرتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔اور جو وجہِ خلش واضطراب بنتے ہیں۔

قرآن کریم چند مستقل اقدار۔ چند غیر متبدل اصول۔ چند ابدی حقائق عطا کرتا ہے جن کی بنیادوں پر انسانی معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ کفر' ان اقدار' اصول اور حقائق سے انکار کا نام ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جن باتوں کو عام طور پر ''نیک کام'' کہا جاتا ہے (اور جن کی مثالیں آپ نے بھی پیش کی ہیں)' اس معاشرہ میں جو خلاف قرآن بنیادوں پر استوار ہوتا ہے' ان کی حقیقت اور وزن کیا ہوتا ہے؟ یہ بات ایک مثال سے سمجھ میں آسکے گی۔ ہندو نظریہء حیات کی رو سے انسانوں کی تفریق و تقسیم پیدائش کی رو سے ہو جاتی ہے۔ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ' محض پیدائشی نسبت سے' ہر شخص کے نزدیک واجب الاحترام ہوتا ہے اور اسے معاشرہ میں وہ مقام اور حقوق حاصل ہوتے ہیں جن میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس' شودر کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ' تمام عمر ذلت اور پستی کی زندگی بسر کرتا ہے اور کوئی طریق ایسا نہیں جس سے وہ معاشرہ میں عزت اور وقار کا مقام حاصل کر سکے۔ خواہ اس کے جوہر ذاتی کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ اب یہی تفریق و تقسیم دولت کی رو سے ہوتی ہے۔ امیر آدمی کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ' ابتدا ہی سے جس مقام پر فائز ہوتا ہے غریب آدمی کا بچہ ساری عمر اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ روح وہی ہے۔ صرف پیکروں کی تبدیلی ہوتی ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں ۔۔۔ اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

برہمن ساری عمر اس نظریہء زندگی کی تلقین کرتا رہتا ہے' اور اسے خدائی تفریق قرار دیتا ہے جسے دنیا کا کوئی انسان مٹا نہیں سکتا۔ ہندو معاشرہ کی تشکیل اسی نظریہء حیات کے مطابق ہوتی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ اگر یہ برہمن' ساری عمر جو اس معاشرہ کے بندھنوں کو مضبوط سے مضبوط کرتا رہتا ہے اور اس طرح کروڑوں انسانوں کو ذلت وخواری کے جہنم میں دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہ کہے کہ وہ چوری نہیں کرتا۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ یا وہ مویشیوں کے پانی پینے کے لئے پیاؤ بنواتا ہے۔ کوڑھیوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے ڈالتا ہے یا اس قسم کے اور ''دان پُن'' کا کام کرتا ہے۔ تو کیا اس کی یہ انفرادی ''نیکیاں'' انسانیت کی میزان میں کچھ بھی وزن رکھیں گی؟ کیا معاشرہ کو غلط بنیادوں پر استوار کرنے کا وہ جرم عظیم جس کا یہ مرتکب ہوتا ہے' ان ''نیکیوں'' کے صدقے میں قابل معافی تصور کیا جا سکے گا؟ اگر میزان کے ایک پلڑے میں یہ نیکیاں رکھی جائیں اور دوسرے پلڑے میں اس کا وہ جرم' تو سوچئے کہ ان میں سے کون سا پلڑا بھاری ہوگا؟ ہماری بھول یہ ہے کہ ہم اس قسم کی انفرادی

> قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانا بہرحال ایک نیک کام ہے جس کا اجر ملنا چاہئے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ انسانیت پر ظلم کرنے والے غلط نظام کے اندر اس قسم کی انفرادی نیکیاں موجب ثواب نہیں بن سکتیں۔ اس جرم کا سیلاب' اس قسم کی جزئی ''مرمتوں'' کو بہا کر لے جاتا ہے

نیکیوں کو بہت بڑے ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ اصول و مبانی کیا ہیں جن کے مطابق انسانوں کی ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اصل شئے' وہ نظام ہے جسے انسان قائم کرتا اور اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر وہ نظام صحیح ہے تو اس کے اندر اس قسم کی انفرادی نیکیاں انسانیت ساز نتائج مرتب کرتی ہیں اگر وہ نظام ہی باطل کی تخریبی بنیادوں پر استوار ہے تو اس میں افراد کی اس قسم کی نیکیاں اس جرم کا کفارہ نہیں بن سکتیں جو انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے روا رکھا جا رہا ہے۔

قرآن کریم یہودیوں کے متعلق کہتا ہے کہ انہوں نے نظام زندگی ایسا قائم کر رکھا تھا جس میں خود ان کے اپنے افراد ایک دوسرے کا گلا کاٹتے تھے اور بالا دست لوگ کمزوروں اور ناتوانوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے تھے۔ اس کے بعد جب ان لوگوں کو دوسرے لوگ قید کر لیتے تھے تو یہ فدیہ دے کر انہیں چھڑاتے تھے اور اسے بڑا نیکی کا کام تصور کرتے تھے۔ حالانکہ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ (2:85) خود ان لوگوں کو گھروں سے باہر نکال دینا سخت جرم تھا۔ اس جرم کے ارتکاب پر تو ان کے دل میں کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی تھی لیکن قیدیوں کو چھڑا کر ثواب حاصل کرنے کے لئے وہ آگے بڑھتے تھے۔

> اگر مسلمان بھی غیر قرآنی نظام پر رضامند ہو چکا ہے تو اس نظام کے اندر اس کی انفرادی نیکیاں وہ نتائج مرتب نہیں کر سکتیں جن کا نتیجہ جنت کی زندگی ہوتا ہے

اس کے بعد قرآن کریم نے ایک عظیم اصول بیان کیا ہے جو اس باب میں بڑی واضح راہ نمائی دیتا ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ (2:85) کیا تم یہ طرز عمل اختیار کرنا چاہتے ہو کہ ضابطہ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھو اور اس کے دوسرے حصے سے انکار کرو۔ اگر یہی روش جاری رکھنا چاہتے ہو تو سن رکھو کہ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85) اس روش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اس دنیا میں بھی ذلت و خواری کی زندگی بسر کرو گے اور قیامت میں سخت ترین عذاب میں مبتلا ہو گے۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے یہاں کس قدر بلیغ اور بلند اصول بیان کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانا بہرحال ایک نیک کام ہے جس کا اجر ملنا چاہیئے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ انسانیت پر ظلم کرنے والے غلط نظام کے اندر اس قسم کی انفرادی نیکیاں موجب ثواب نہیں بن سکتیں۔ اس جرم کا سیلاب' اس قسم کی جزئی ''مرمتوں'' کو بہا کر لے جاتا ہے اور اس تمام عمل کا کلی نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اس قسم کی غلط ذہنیت قریش مکہ کی تھی جس کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ان سے کہا گیا کہ أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (19:9) کیا تم سمجھتے

ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانے کے لئے سبیلیں لگا دینا یا خانہ کعبہ کی تعمیر و تزئین کے کاموں میں حصہ لینا اس شخص کے اعمال کے برابر ہے جو صحیح نظام زندگی کی ابدی حقیقتوں (ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت) پر یقین رکھتا ہے اور پھر اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے؟ تم اپنے ذہن سے کچھ ہی کیوں نہ فیصلہ کرلو لَا یَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰہِ۔ میزان خداوندی میں ان کا وزن برابر نہیں ہوسکتا۔ غلط نظام قائم کرنے والے اس قسم کے انفرادی نیک کاموں کے باوجود ظالم کے ظالم رہتے ہیں اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ظلم کرنے والوں پر نجات وسعادت کی راہیں کبھی کشادہ نہیں ہوتیں۔ وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ (9:19)۔

> یہ نیکیاں صحیح نتائج پیدا ہی اس وقت کرتی ہیں جب یہ صحیح قرآنی نظام کے اندر سرزد ہوں۔ غلط نظام میں یہ تعمیر انسانیت کے نتائج مرتب ہی نہیں کرسکتیں

ہمارا خیال ہے کہ ان مختصر سی توضیحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہوگی کہ ''کافر'' کے نیک اعمال میزان خداوندی میں وزن کیوں نہیں رکھتے! جو شخص کسی مملکت کے خلاف بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہو وہ ذاتی طور پر کتنا ہی اچھا شہری کیوں نہ ہو اس کی یہ انفرادی خوبیاں جرم بغاوت کا کفارہ نہیں بن سکتیں۔ کفر' درحقیقت نظام خداوندی کے خلاف بغاوت کا نام ہے۔۔۔خواہ وہ بغاوت عملی ہو یا ذہنی (اعتقادی)۔

باقی رہا یہ کہ مسلمان' بغیر نیک اعمال کے بھی جنت میں چلا جائے گا تو یہ ''حدیث بے خبراں'' ہے۔ جس کا حقیقت سے کچھ تعلق نہیں۔ جنت تو نام ہی اعمال کے فطری نتائج کا ہے۔ وَتِلۡکَ الۡجَنَّۃُ الَّتِیۡۤ اُوۡرِثۡتُمُوۡہَا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (43:72) البتہ اس ضمن میں دو ایک بنیادی باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(1) اگر کہیں صحیح قرآنی نظام قائم ہے یا اس کے قیام کے لئے جدوجہد کی جا رہی ہے تو اس میں اگر کسی سے سہواً اور خطاءً کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہوگئی ہے اور وہ اس پر نادم ہو کر آئندہ اس سے محتاط رہتا ہے تو اس کے اعمال حسنہ کا پلڑا بھاری رہے گا۔

(2) اگر مسلمان بھی غیر قرآنی نظام پر رضامند ہو چکا ہے تو اس نظام کے اندر اس کی انفرادی نیکیاں وہ نتائج مرتب نہیں کرسکتیں جن کا نتیجہ جنت کی زندگی ہوتا ہے۔

ہم (مسلمان) صدیوں سے اس غلط ذہنیت کا شکار ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں نیک لوگوں کی نیکیاں بھی کوئی نیک نتیجہ مرتب نہیں کرتیں۔ یہی وہ غلط ذہنیت ہے جس کی اصلاح کے لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ نیکی تو اس کی ہے جو

(i) خدا پر' آخرت پر' ملائکہ پر' کتب خداوندی پر اور انبیاء پر ایمان رکھتا ہے۔ (یعنی ان اصولوں پر جو نظام خداوندی کی بنیاد بنتے ہیں)۔

(ii) مال اور دولت کی محبت کے باوجود' اسے ضرورت مند قربیوں۔ یتیموں۔ مسکینوں۔ نادار مسافروں۔ محتاجوں کے لئے دے دیتا ہے۔ نیز دوسروں کی غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے۔

(iii) جو نظام صلوٰۃ وزکوٰۃ قائم کرتا ہے۔

(iv) جو اپنے عہد کا پابند ہوتا ہے (اور اس عہد میں بنیادی حیثیت اس عہد کی ہوتی ہے جو اس نے اپنے خدا سے کر رکھا ہوتا ہے اور جس کی رو سے اس نے اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھوں بیچ دیا ہوتا ہے (9:110)۔

(v) جو ان مصائب ومشکلات میں جو اس راہ میں اسے درپیش ہوں' ثابت قدم رہتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعویٰ ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں اور یہی ہیں جنہیں متقی کہا جاسکتا ہے (2:178)۔

> دہی کے برتن میں جتنا دودھ جی چاہے ڈالتے جایئے۔ سب دہی بنتا جائے گا

نیکی ان لوگوں کی ہے نہ کہ ان کی جو غیر خداوندی نظام پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اور دیگر انفرادی نیکیاں انہیں جنت کا وارث بنا دیں گی۔

آپ نے غور فرمالیا کہ غیر مسلموں کی انفرادی نیکیاں تو ایک طرف' خود ان مسلمانوں کی انفرادی نیکیاں' جو غیر خداوندی نظام پر مطمئن ہوں' میزان خداوندی میں کیا وزن رکھتی ہیں؟ انفرادی نیکیاں نہایت ضروری ہیں۔ لیکن یہ نیکیاں صحیح نتائج پیدا ہی اس وقت کرتی ہیں جب یہ صحیح قرآنی نظام کے اندر سرزد ہوں۔ غلط نظام میں یہ تعمیر انسانیت کے نتائج مرتب ہی نہیں کرسکتیں۔

دریاؤں اور ندیوں کا میٹھا پانی' انسانوں اور حیوانوں کے لئے زندگی بخش اور زمین مردہ کے لئے حیات آور ہوتا ہے لیکن وہی پانی سمندر کے اندر پہنچ کر' اپنی تمام زندگی بخش صلاحیتیں کھو دیتا ہے۔ دہی کے برتن میں جتنا دودھ جی چاہے ڈالتے جایئے۔ سب دہی بنتا جائے گا'' قرآنی نظام'' یا اس نظام کے قیام کے لئے جدوجہد۔۔ اور اس کے ساتھ اخلاقی نیکیاں۔ یہ ہے وہ پروگرام جسے قرآن ''ایمان اور اعمال صالح'' کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ اس دنیا اور اس کے بعد کی زندگی دونوں میں جنت کی وراثت ہے اور یہ پروگرام قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔

The Human Self and Allah

Episode No. 8

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

Keep these Divine verses in frontand then cast your eyes on any part of the current day civilised world, and then sometimes peep and search into the most delicatecorners of your heart, and then seehow many worlds of facts and realities are concealedwithin this one verse. We have already seen that the Quran declares that chaos arises throughaccepting more than one *Ilaah*. Just ponder, is the reason for this chaos and mayhemthat is erupting from all sidestoday not simply this, that every human heart is becoming anabode for idols? Every group and every nationhas madetheir own desires intotheir gods and under the influence and control of these 'gods of desires and emotions', no distinction between right and wrong is retained. Right is that through which an aim is achieved (according to Lenin and Machiavelli) and wrong is that which obstructs the achievement of aims. These are those idols which have turned the world into hell. These idols are not carvedat the home of some sculptor but are in fact continuallymoulded in the factory of the human mind. Their abode is not some temple but the human heart. The idol of possessions and progeny, the idol of prestige and status, the idol of wealth and prosperity, the idol of regime and government, the idol of nation and race - and Allah knows[1] what kind of *Laat* and *Manat* and what kind of *Habl* and *Uzza*[2] are concocted in the human mind at every moment.

This is that frightening and terrifyingcliff edgeof *Shirk*from which,having slipped, man falls straight into the dreadful destruction and ruin of hell. The Quran has stated that these are those people who go astray despite knowledge. Knowledge differentiates between *Haqq* and *Batil*, but once emotions overwhelm the intellect and desires overpower the mind then knowledge and intellectare never able to show the right path. Having reached this stage, man's ears become deaf to the bells of danger, veils descend over his eyes, his heart becomes rusty and he cannot see the consequences of the results of his deeds. According to George Bernard Shaw, 'Europe is flowing along ona river of emotions and does not consider what kind of an ocean of ruins its end is'[3] . There is no dearth of knowledge in Europe, but all the

---

[1] This means that if we use the light of the Quran then we, too, can identify all of these man-made idols. (Ed)

[2] *Laat*, *Manat*, *Habl*, *Uzza* - these are idols of the era when the Quran was revealed. (Ed)

[3] Bernard Shaw uttered these words prior to the war in Europe (1939). This war made it clear what that ocean of destruction was in which Europe drowned through its own hands. For further details see *Insaan Ney Kiya Socha* (What Did Man think).

knowledge is being usedinthis endeavour,to find what kinds of techniques can be most effective and implemented most rapidly for its own supremacy and for the slaughter of others. The very cause for Allah's earthbeing so constrictedfor mankindtoday is the fact that this knowledge is functioning in submission to the emotions. Man has made his own desires into his deity. If knowledge works globally according to the true*Ilaah* and His laws, then this same hell will become a paradise. Knowledge will,at this time too,still think of making guns and ammunition, but after the gun is made, its direction will not be decided according to the vested interests of men. The decision whether the gun will be used to haltthe evil of a tyrant,or whether its target will be the home of weak and feeble nations, will not be made by the manufacturer of the gun but will be made by another power. This is that very point where man is in need of heavenly guidance and *Wahi*. When man uses the outcome of his knowledge according to the laws of Allah, then this same knowledge which today is the destroyerof humanity will become a blessing for humanity. And then the true meaning of '*There is no Ilaah, but Allah*'[1] will be comprehended.

Cast an eye one more time on the attributes of the real *Ilaah* which have been presented to you in the previous pages and see if there is any such aspect of life omitted for which there is the need to seek another '*Ilaah*':

a) Who gives life
b) Provider of nourishment
c) Provider of sustenance
d) Who bestows peace and security
e) Who is always watching
f) Who solves problems
g) Who sets things right in all matters
h) In Whom complete trust can be placed
i) Who is called out to in times of hopelessness
j) Who has control of benefit and harm
k) Who has knowledge of both the visible andthe unseen
l) Who has power over all
m) Who is Owner of supremacy
n) Who is beyond any fault
o) Master of masters
p) The TrueSovereign
q) For Whose life there is no end
r) To Whom all turn for help

Can there be another being other than this BeingWho is capable of having obedience to Him accepted,Whose sovereignty should be acknowledgedand before Whose laws man should bow? After this, think, what is the meaning of *La-Ilaha?*

[1] *La-Ilaha-il-Lallah* – this is the Arabic as already noted earlier. (Ed)

But not only *La*, after this *Illa* as well i.e. after the negative comes the positive, the affirmation; construction after destruction; acceptance after refusal; after *La-Ilaha -il-Lallah*. Let us now go to *Illa* after this *La* because just as acknowledgement of the true Allah is impossible until every non-divine force has not been rejected, in this same way mere rejection is also anarchy and chaos until there has not been acceptance of Allah. *La-Ilaha-il-Lallah* – this is the complete Eimaan.

3 Allah

As has already been stated under the previous topic, the personal name of God according to the Quran is Allah which is a combination of *Al* and *Ilaah* i.e. that One *Ilaah* Whose concept is presented by the Quran, and Whose attributes have been explained in it in such great detail.

3.1 Graspingthe Reality of the Self

What is Allah? What kind ofBeing is He? What is the form and reality of His Self? Where did He come from? These are those questions whose answers are outwith the scope of human intellect. Intellect is,in actuality, the name of those collective outcomes which man achieves through his knowledge and observations, and it is obvious that the means through which manobtains knowledge are finite. So when those means are finite, then theproduct of those means will also be finite, and how can the finite conceive the infinite? What can that man who so far has not even been able to determine what he himself is, determine as to what Allahis? How can thatindividual who is restricted in reaching the reality of a machine encompass the form and reality of the creator of the machine? Knowledge of the composition of the Divine Self is beyond the scope of human vision. This is the reason that the Quran does not demand visual recognition of Allah – it demands acceptance of*Eimaan* (in Allah).

3.2 *Eimaan* and *Irfaan* (Recognition)

The second method by which to evaluate something which man is not able to comprehend directlyis to appraisesomething which is similarto it;however, that Being (Self of Allah) has no example like it and is invisible:

…there is nothing whatever like unto Him…(42:11)

Therefore, how canthe form of Allah be envisioned by the human mind?

Habituated to perceiving thingsvia his senses, man always desires that even the most abstract realitiesshould display before him inthephysical form,or at least thatthis metaphysical reality should beinterpreted insuch a way that it can forma tangible concept in his mind. This was that fundamental error as a result of which man

adoptedthe worship of idols. Since Islam is a Deen of intellect and reasoning, it therefore closed all those doors through which the paths of this kind of superstition could enter the human mind. It has not mentioned any such example about the Divine Self which may, as a consequence, cause thehuman mindto drift towardssome concrete and visible form of Allah. The Quran wishes to preservereality as reality; it does not wish toconvertthe Divine Self intoa sculpture in order to fulfil a demand of the human mind.

3.3 Divine Attributes

As has already been written, the reality and form of the Divine Self are beyond the boundaries of perception. However, no-one (barring a few atheists) denies the existence of God. This denial by atheists is also not really a denialbut merely a twisting of words. According to believers the power which is maintainingdirection and order in the universe is God, and according to non-believersit is nature. Their mindscan neither encompass the form of the Divine Self nor can they express the reality of nature. The human mind can determine the process of cause and effect up to the extent of the physical world but cannot reach the truth of the first cause.

The things by which the concept of Allah is imprinted on the mind are His attributes i.e. what powers Allah is Master of, what are the various ways in which His laws operatein the system of the universe etc., etc. Through the correct concept of the Divine attributes, the correct *Eimaan* about the real Allahtakes birth in the human heart,whereas through the incorrectinterpretationof these attributes, man becomesa follower of falsehood. The Quran has explained the Divine attributes in such detail and with such precision that man is enabled to establish the correct concept of Allah according to these. No religion among all the religions of the world is such that itcanstatewith surety and certainty that its heavenly book is free from any tampering and additions and pure from contamination by the human mind. Leaving asidethe claiming of this with certainty and surety, they admit and agree that they do not even possess the book of the founder of their religion in its original form.

3.4 God As Invented by the Human Mind

So it is obvious now that the kind of concept which the human mind will manufacture about god according to these books which have been tampered with, willonly be aprototype of those human ideas themselves i.e. the attributes of god will merely be an extended form of human attributes themselves. For example, man has two hands and god will be given four hands. Man can pick up a stone, so god will be able to lift a

❶ Details of these matters will be available in my book titled, *Mazahab-e-Aalim ki Asmaani Kitabein*.

a mountain. Man has a height of around five or six feet, so god will have a height of fifty or sixty feet. The gods and goddesses of India and the statues of Greek idols are manifestations of this very belief. Outwith man himself and the signs of nature, the human mind is not capable of constructing anyother concept of god, and the greatest inherentproof of this fact is that otherDivine books have been adulterated by the human mind.

3.4.1 Concept of God in *Vedas*[1]

For example,according to the heavenly book claimed by Hindus,*Vedas*, *Rig Vedas 10*, Hymn 90, Mantra 12-13 and *Rig Vedas 31*, Mantra 11-12 has the following:

The Brahman was born from his mouth, and from both his arms the Kashtri caste of people were born. The ones who are the Vaish were born from his thighs, and from both feet of Parmeshwar the poor Shudar wereborn. The moon was born from his mouth and from his eyes the sun was born; the goddesses Inder and Agni were born from his mouth, and from his breath the air was born!

Or, for example,in *Rig Veda 31*, Mantra 13 contains the following:

The middle class was given birth from the navel of Parmeshwar (god), and the upper class was given birth from his head. The two ears of Parmeshwar bore the Earth, and the planets and astral bodies were born from his ears.
In *Atharvaveda*, *Kanda 11*, Hymn 2, Mantra 5-6, God'sform is described as follows:

O Lord of our life! The supreme Soul! Greetings to your face. Greetings to your eyes also, your skin, your limbs, and greetings to you and your belly, greetings to your tongue. Greetings to your face, and to your teeth, and greetings to the smell of your teeth.

3.4.2 Worship of Snakes

In *Yajurveda*, Hymn 13, Mantra 6-8:

Prostration to the earth-dwelling snakes, and our prostration to those snakes that are in the wind or heavens. And our prostration to those snakes who either come with arrows or are in the crops, or those snakes that are in their holes. And let our prostrations be accepted by those snakes thatlive in the rays of the sun or live in waters.

---

[1] The quotes as detailed from this are translated from the Urdu version by the author. (Ed)

3.4.3 Prostration to a Razor

In *Yajurveda*, Hymn 3, Mantra 63:

O razor! You are the doer of all things and are made of good iron. Prostration to you that you do not harm this child.

3.4.4 Prostration to Fever

In*Atharvaveda*, *Kanda 1*, Hymn 25, Mantra 4:

May prostration to the winter fever be accepted and I also prostrate to the summer fever known as Roru. May my prostration to the fever that occurs daily, every second and third daybe accepted!

It is obviousthat the concepts of things considered worthy of worshipas mentioned above are the creation of the limited thinking of man. Kant has written that whatever type of god a nation adopts for its worship, that god is a reflection of the culture and civilisation of that nation, because it is a requirement of the holiness and status of this god that man should present it in the best attire. Therefore, the god proposed by any nation i.e. that god which is aproduct of the human mind, will make evident the endpoint of the state of intellectual evolution of that nation.[1]

3.4.5 The Belief of Avatar[2]

The belief of avatar is also a reflection of this same inclination of man. Whenever man observed any trait in a human being which was less commonlyfound among the general masses, that human beingwas immediately considered as being superhuman and conceptualised as a god in the shape of man. By adopting this very belief of avatar, Christianity moulded it into the doctrine of the divinity of Christ. In his book '*Researches in Oriental History*', Dr. Brown[3] has proven with prodigious research and effort that the divinity of Christ is simplyan echo of this belief of avatar. Apartfromthis, many Christian researchers have reached the conclusion that most of the current teaching of Christianity is taken from the ancient teaching of Buddhism. This is why the famous historian Max Muller writes in his book'*Science of Religion*':

The language of Buddha and his pupils and the language of Christ and his companions are found to have strange similarities. It appears to be as if many tales and metaphors of Buddhism are drawn from the time of the Bible, although it is obvious that these existed in the world well before the start of the Christian calendar (A.D.).[4]

---

1. This is a very powerful statement of fact which can be verified through evidence by examining the state of the human world up till now. (Ed)
2. Avatar -a manifestation of a deity or released soul in bodily form on earth; an incarnate divine teacher. (Oxford Dictionary)
3. Dr George W. Brown, *Researches in Oriental History*
4. This is translated from Urdu as quoted in the book by the author. (Ed)

Ernst von Bunsen writes in his book '*Angel-Messiah of Buddhists, Essenes and Christians*':
It is a strange fact that whatever is seen about the life and teaching of Buddha in the oldest records which are available regarding Buddhism, is noted to be glaringly similar to those narrations about Christ which are found in the Bible. It is not possible that this should be calledpure coincidence, and this surprising thingincreases further when it is seen that these narrations are found only in Pauline Epistles and the Fourth Book. There is no mention of these in the books before these.[1]

Our purpose in mentioning this is that when man devises a god using his own mind, then god becomesmerelya man. From the attributes which the Quran has detailed about Allah, the Supreme and Omnipotent, it becomes clear how great the difference is between human thoughts and this teaching of the Quran,the source of which is beyond the reach of the human mind.

3.5 He is One

A detailed description of each of the Divine attributes in turn will be covered in subsequent chapters. But there are four attributes among them which are such that they are mentioned by the Quran in a short Surah in such a way as if these are the fundamental attributes of Allah. This Surah is as follows:

Say: He is Allah, the One and Only; Allah the Eternal, Absolute (As-Samad); He begets not, nor is He begotten; and there is none like unto Him. (112:1-4)

Before moving on to other attributes, we wish to discuss these four attributes under this topic. The fundamental attribute of the Divine Self is *Ahdeat*(Oneness). Though *Ahad* and*Wahed*generally mean one i.e. one with whom there is no other, in *Ahdeat* the aspect of uniqueness is predominant. The fundamental character of a self (personality) is that it is unique in itself. No self can share in another self. This is called its individuality. Therefore, the Self of Allah is *Ahad* (alone) and none shares init. It is unique and no-one else can be included in it.

3.5.1 *Batil* [2] of the Belief of Magians

By virtue of the self being *Ahad* (one), firstly this belief of the Magians that *Ahrman* and *Yazdan* are two permanent entities as godsis falsified:

Allah has said: 'Take not (for obedience) two Ilaahs; for He is just One Ilaah:Then fear Me (and Me alone)'. (16:51)

To Be Continued

---

[1] This is also translated from Urdu as quoted by the author in the book. (Ed)

[2] *Batil* – falsehood. It is the opposite of *Haqq* which means truth. (Ed)

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امورِ دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہوجائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم دگر مدغم ہوجائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوجاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کررہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردوبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہوسکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کرسکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.75
ISSUE
7

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam

وَ كَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰى وَمَنۡ حَوۡلَهَا وَتُنۡذِرَ يَوۡمَ الۡجَمۡعِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ‌ؕ فَرِيۡقٌ فِى الۡجَـنَّةِ وَفَرِيۡقٌ فِى السَّعِيۡرِ ۞

تمہاری طرف سے صاف اور واضح ضابطۂ قوانین اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ تم، اس کے ذریعے، اس مرکزی بستی (مکہ) اور اس کے اردگرد کی آبادیوں کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج وعواقب سے آگاہ کردو۔ اور انہیں متنبہ کردو کہ (اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئے، تو اس کشمکش کے آخری فیصلہ کے لئے، تمام لشکر میدان میں جمع ہوں گے۔ پھر ایک گروہ، (فاتح ومنصور حیثیت سے) جنتی معاشرہ میں داخل ہوگا اور دوسرا فریق (خاسر ونامراد) تباہیوں کے جہنم میں جا گرے گا۔ ان سے کہہ دو کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں (یہ اس دنیا میں بھی ہوگا اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی)۔ (مفہوم القرآن، سورۃ الشوریٰ: 7)